امین احسن اصلاحی

مبادیٔ تدبرِ قرآن

امین احسن اصلاحی

سلسلۂ مطبوعات نمبر ۸

جملہ حقوق محفوظ

جدید ایڈیشن

ناشر : ـــــــــ ماجد خاور

مطبع : ـــــــــ مکتبہ جدید پریس لاہور

طابع : ـــــــــ رشید احمد چودھری

اشاعت : ـــــــــ فاران فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام؛ طبع سوم؛ پانچ سو

تاریخ اشاعت : ـــــــــ جون ۱۹۹۶ء - محرم ۱۴۱۷ھ

ادارہ : ـــــــــ فاران فاؤنڈیشن

۱۲۲ - فیروز پور روڈ - اچھرہ

لاہور ـــ ۵۴۶۰۰ - پاکستان

فون : ۷۵۹۵۱۰۰ - ۰۴۲

قیمت : 105.00=

فہرس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

میں اس بات کا آرزو مند تھا کہ میری ناچیز تالیفات، بالخصوص تدبرِ قرآن، کی طباعت واشاعت کی ذمّہ داری کوئی ایسا شخص اٹھائے جو اس فکر کا حامل ہو جو ان کتابوں میں پیش کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے یہ آرزو پوری کر دی۔ عزیزم ماجد خاور صاحب سلمہٗ میرے پرانے رفقاء میں سے ہیں۔ وہ نہ صرف میرے فکر سے بلکہ بحیثیتِ مجموعی پورے فکرِ فراہی سے بڑی گہری دل چسپی رکھتے ہیں۔ انہوں نے پورے عزم و حوصلہ کے ساتھ اب اس فکر کی ترویج و اشاعت کا بیڑا اٹھالیا ہے اور وہ اپنے ادارہ: فاران فاؤنڈیشن کو، اس کے قیام کے دن سے ہی، اسی مقصد کے لیے مختص کیے ہوئے ہیں۔ مجھے ان کی صلاحیتوں سے پوری توقع ہے کہ وہ اس خدمت کو بحسن و خوبی انجام دے سکیں گے اور خدا نے چاہا تو آئندہ تھوڑے عرصہ میں، ان کے اور ادارۂ تدبرِ قرآن و حدیث کے تعاون سے وہ قرآنی فکر و فلسفہ بالکل واضح ہو کر لوگوں کے سامنے آجائے گا جو اس عہد کے چیلنج کا اصل جواب ہے۔

حضرت الاستاذ مولانا امین احسن صاحب اصلاحی مدّظلّہ العالی نے جس

بے پایاں محبت واعتماد کا اظہار اپنی محولہ بالا تحریر ـــــ دیباچہ تدبرِ قرآن ـــــ میں فرمایا ہے وہ مجھ عاجز کے لیے سرتا سر اعزاز ہے۔ ان کے اور میرے درمیان اصلاً استاد و شاگرد کا رشتہ ہے جو ۱۹۶۲ء میں قائم ہوا۔ مصنف و ناشر کا رشتہ ان کی نظرِ عنایت سے ۱۹۷۶ء میں استوار ہوا۔ انہوں نے میری تعلیم و تربیت میں آج تک جو کمال رافت فرمائی اور مشقت اٹھائی ہے رسمی اسلوبِ بیان میں اس کا اظہار نا ممکن ہے۔ ان سے نسبت ہی میرا سرمایۂ حیات ہے۔ ان کے دیے ہوئے پروگرام کی تکمیل ہی میری زندگی کا مشن اور ترجیحِ اوّل ہے۔ انہوں نے جو شرف بخشا اور اپنے جس عظیم اعتماد کا اظہار فرمایا ہے خدائے بزرگ و برتر کے حضور ملتجی ہوں کہ وہ مجھے ان کی امیدوں کا مصداق بنائے اور فکرِ فراہی و اصلاحی کی ترویج و اشاعت کا جو زرّیں تاج مجھ بے مایہ فقیر کے سر پر سجایا گیا ہے اس کی لاج رکھے۔ وبید اللہ التّوفیق!

حضرت الاستاذ کا ذوق آشنا ہوتے ہوئے میرے لیے یہ لازم تھا کہ ان کی نگارشات کو ان کے مطلوبہ پسندیدہ معیار کے مطابق پیش کروں۔ چنانچہ میں نے اپنے طور پر ان پر کام شروع کر دیا۔ میں نے بیک وقت شاگرد و ناشر، دونوں حیثیتوں کے تقاضوں کو پورا کرنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ الحمدللہ نظرِ ثانی اور ازسرِ نو کتابت کا بیشتر کام مکمل ہو چکا ہے۔ یہ پیشکش بھی اسی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی ایک کوشش ہے۔ اس کتاب کے جدید ایڈیشن میں مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھا گیا ہے:

۱۔ متن پر نہایت اہتمام سے نظرِ ثانی کی گئی ہے۔

۲۔ قرآن مجید کے تمام حوالے مکمل نقل کیے گئے ہیں اور ان کا ترجمہ تدبرِ قرآن کے مطابق کر دیا گیا ہے۔

۳۔ کتاب میں موجود تمام اقتباسات کو ان کے اصل ماخذوں سے تقابل کر کے درست کر دیا گیا ہے اور حوالے مکمل نقل کر دیے گئے ہیں۔ مزید برآں بعض جگہ اگر صرف ترجمہ دیا گیا تھا تو ان کی اصل عبارتیں بھی دے دی گئی ہیں۔

اس کتاب کے جدید ایڈیشن کی پیشکش کے غیر معمولی اہتمام کی وجہ سے اس کی دستیابی میں کچھ عرصہ تعطّل رہا جس کے لیے میں انتہائی معذرت خواہ ہوں۔ امید ہے کہ اس کے امتیازی محاسن کی روشنی میں اس کے قدر داں مجھے معاف فرمادیں گے۔ اب اس کا موجودہ ایڈیشن إن شاء اللہ ہمیشہ دستیاب رہے گا۔

اس پیشکش میں ہر ممکنہ احتیاط کے باوصف، اپنی کوتاہیوں کے لیے پیشگی معذرت خواہ ہوں۔ میری درخواست ہے کہ اس کے قارئین بھی اس کام میں حصّہ لیں۔ ان کی جانب سے ہماری کوتاہیوں کی نشان دہی اور بہتری کی ہر قابلِ عمل تجویز خندہ پیشانی اور شکریہ کے ساتھ قبول کی جائے گی اور آئندہ اشاعتوں میں ان کا لحاظ رکھا جائے گا۔

اس پیشکش کی صورت میں مجھ بندۂ حقیر و فقیر سے جو خدمت بن پائی یہ سرتاسر اس کی توفیق اور تائید و نصرت کا کمال ہے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

والسلام
ماجد خاور

لاھور
۲۶ جون ۱۹۸۸ء

دیباچہ

میں نے اوّل اوّل جب اپنے استاد، مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے طرزِ فکر سے اردو خواں طبقہ کو روشناس کرانا چاہا تو مدرستہ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ (یو۔پی)، بھارت سے ۱۹۳۶ء میں 'الاصلاح' کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا جو ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۹ء تک جاری رہا۔ اس رسالے میں میں نے مولاناؒ کی تفسیر نظام القرآن کے مطبوعہ اجزاء کے ترجمے بھی شائع کیے اور مختلف مضامین میں مولاناؒ کے اصولِ تفسیر بھی بیان کیے۔ یہ مضامین اونچے علمی حلقوں میں بہت پسند کیے گئے اور انہی کی طلب پر بعد میں یہ 'تدبرِ قرآن' کے عنوان سے کتابی صورت میں بھی چھاپے گئے۔

میری نگاہ میں اس کتاب کی جو قدروقیمت ہے اس کا اندازہ کرنے کے لیے غالباً اس امر کی یاددہانی کافی ہوگی کہ میں اس کو اپنی تفسیر 'تدبرِ قرآن' کا جیسا کہ میں نے تفسیر کے مقدمے میں اشارہ کیا ہے، مقدمہ بنانا چاہتا تھا، لیکن بعض وجوہ سے، جن کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں، مجھے یہ رائے تبدیل کرکے تفسیر کے لیے الگ مقدمہ لکھنا پڑا۔ تاہم اس کی اہمیت اب بھی میرے نزدیک اتنی ہے کہ میں ہر اس شخص کو جو ہمارے طریقہ پر قرآن پر غور کرنا چاہتا ہو،

یہ مشورہ دوں گا کہ وہ اس کتاب کو نہ صرف ایک بار بلکہ بار بار غور سے پڑھ لے، اسی سے اس کو تدبرِ قرآن کے ان اصولوں کی طرف رہنمائی ہوگی جو میں نے اپنے استاد سے سیکھے تھے اور جو میں نے اپنی تفسیر میں ملحوظ رکھے ہیں۔ میرے نزدیک یہی اصول ہیں جو ہمارے سلفِ صالحین میں سے ان لوگوں نے ملحوظ رکھے جن کو علمِ قرآن میں سے حصّہ ملا اور آج بھی وہی لوگ قرآن میں سے کوئی حصّہ پائیں گے جو ان اصولوں کو رہنما بنا کر قرآن میں غور کریں گے۔

اس مجموعے میں اصل مضامین تو وہی ہیں جو میرے قلم سے الاصلاح کے دَور میں نکلے ہیں لیکن محض تکمیلِ بحث کے لیے بعض مضامین بعد کے دور کے بھی میں نے اس میں شامل کر دیے ہیں، اس اضافہ سے بعض مقامات میں پڑھنے والوں کو کچھ تکرار سی محسوس ہوگی۔ میں چاہتا تو آسانی سے کتاب کے اس عیب کو دُور کر دیتا لیکن محض اس خیال سے اس عیب کو گوارا کر لیا کہ یہ مباحث نہایت اہم ہیں، اس تکرار سے اس فائدے کی توقع ہے کہ یہ اچھی طرح قاری کے ذہن نشین ہو جائیں گے اور یہ چیز مجھے اتنی عزیز ہے کہ میں تصنیفی حسن کو کسی حد تک قربان کر کے بھی اس کو حاصل کرنے کا آرزو مند ہوں۔

تفسیر، تدبرِ قرآن سے امتیاز کے خیال سے اس کتاب کا نام 'مبادیٔ تدبرِ قرآن' کر دیا گیا ہے۔ وَآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العالمین۔

والسلام

امین احسن اصلاحی

لاہور

۱۹، ستمبر ۱۹۶۹ء

فہمِ قرآن کے لیے چند ابتدائی شرطیں

جس طرح نماز کے لیے طہارت اور وضو شرط ہے، نماز کی برکت آدمی کو اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب وہ وضو اور طہارت کے شرائط پورے کر کے نماز کا قصد کرے، اسی طرح فہمِ قرآن کے لیے بھی کچھ ابتدائی شرطیں ہیں اور آدمی کو فہمِ قرآن کی نعمت اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ ان شرائط کے اہتمام کے ساتھ قرآن مجید کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ ہم یہاں مختصراً ان شرائط کو بیان کرنے کی کوشش کریں گے۔

نیّت کی پاکیزگی:

سب سے پہلی چیز نیت کی پاکیزگی ہے۔ نیت کی پاکیزگی سے مطلب یہ ہے کہ آدمی قرآن مجید کو صرف طلبِ ہدایت کے لیے پڑھے، کسی اور غرض کو سامنے رکھ کر نہ پڑھے۔ اگر طلبِ ہدایت کے سوا آدمی کے سامنے کوئی اور غرض ہوگی تو نہ صرف یہ کہ قرآن کے فیض سے محروم رہے گا، بلکہ اندیشہ اس بات کا بھی ہے کہ قرآن سے جتنا دور وہ اب تک رہا ہے اس سے بھی کچھ زیادہ دُور ہٹ جائے۔ اگر آدمی قرآن کو اس لیے پڑھے کہ لوگ اسے مفسّرِ قرآن سمجھنے لگیں اور وہ کوئی تفسیر لکھ کر جلد اس سے شہرت اور نفعِ دنیاوی حاصل کر سکے تو ممکن ہے اس کی یہ غرض حاصل ہو جائے، لیکن قرآن مجید کے علم سے وہ محروم رہے گا۔ اسی طرح اگر آدمی کے کچھ اپنے نظریات ہوں اور وہ قرآن کی طرف اس لیے رجوع کرے

کہ ان نظریات کے لیے قرآن سے کچھ دلائل ہاتھ آجائیں تو ممکن ہے وہ قرآن سے کچھ الٹی سیدھی دلیلیں، اپنے خیال کے مطابق، اپنے نظریات کی تائید میں نکالنے میں کامیاب ہو جائے، لیکن ساتھ ہی اس حرکت کے سبب سے وہ اپنے اوپر فہم قرآن کا دروازہ بالکل بند کرلے گا۔

قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کا صحیفہ بنا کر اتارا ہے اور ہر آدمی کے اندر طلب ہدایت کا داعیہ ودیعت فرمایا ہے۔ اگر اسی داعیہ کے تحت آدمی قرآن مجید کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ اس سے بقدرِ کوشش اور بقدرِ توفیقِ الٰہی فیض پاتا ہے۔ اگر اس داعیہ کے علاوہ کسی اور داعیہ کے تحت وہ قرآن کو استعمال کرنا چاہتا ہے تو 'لِکُلِّ امْرِءٍ مَّا نَوٰی' کے اصول کے مطابق وہ وہی چیز پاتا ہے جس کی اس کو تلاش ہوتی ہے۔ قرآن مجید کی اس خصوصیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کی تعریف یہ فرمائی ہے کہ 'یُضِلُّ بِہٖ کَثِیْرًا ۙ وَّیَھْدِیْ بِہٖ کَثِیْرًا ط' (البقرۃ - ۲ : ۲۶) (اللہ اس چیز سے بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے) اور یہ اصول بیان فرمانے کے بعد یہ بات بھی واضح کر دی ہے کہ 'وَمَا یُضِلُّ بِہٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ' (البقرۃ - ۲ : ۲۶) (اور وہ نہیں گمراہ کرتا مگر انہی لوگوں کو جو نافرمانی کرنے والے ہیں)۔ یعنی جو لوگ فطرت کی سیدھی راہ سے ہٹ کر چلنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہدایت سے بھی ضلالت ہی حاصل کرنا چاہتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو وہی چیز دیتا ہے جس کے وہ بھوکے ہوتے ہیں۔ اگر ایک شخص کعبہ جا کر بھی بتوں ہی کو یاد کرنا چاہتا ہے تو وہ ہرگز اس بات کا سزاوار نہیں ہے کہ اس پر توحید کے رموز کھولے جائیں۔ اگر کوئی شخص پھولوں کے اندر سے بھی کانٹے ہی جمع کرنے کا شوق رکھتا ہے تو وہ ہرگز اس کا مستحق نہیں ہے کہ اس کو پھولوں کی خوشبو نصیب ہو۔ اگر ایک شخص اپنے فسادِ طبیعت کے سبب سے علاج کو بھی بیماری ہی بنا لیتا ہے تو وہ اسی بات کے لائق ہے کہ شفا حاصل ہونے کے بجائے اس کی بیماری ہی میں اضافہ ہو۔ اسی حقیقت کی طرف قرآن حکیم نے سورۂ بقرہ کی مندرجہ ذیل آیت میں اشارہ فرمایا ہے:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ۝ (البقرۃ - ۲ : ۱۶)	یہی لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت پر گمراہی کو ترجیح دی تو ان کی تجارت ان کے لیے نفع بخش نہ ہوئی اور یہ ہدایت پانے والے نہ بنے۔

قرآن کو ایک برتر کلام مانا جائے:

دوسری چیز یہ ہے کہ قرآن مجید کو ایک اعلیٰ اور برتر کلام مان کر اس کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اگر دل میں قرآن مجید کی عظمت و اہمیت نہ ہو تو آدمی اس کے سمجھنے اور اس کے حقائق و معارف کے دریافت کرنے پر وہ محنت صرف نہیں کر سکتا جو اس کے خزائنِ حکمت سے مستفید ہونے کے لیے ضروری ہے۔ بظاہر یہ بات بعض لوگوں کو کچھ عجیب سی معلوم ہو گی کہ ایک کتاب کے متعلق اس کے جاننے سے پہلے ہی حسنِ ظن قائم کر لیا جائے کہ وہ بڑی پُر حکمت اور اعلیٰ کتاب ہے۔ لیکن غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ قرآن مجید کے متعلق اس قسم کا حسنِ ظن پیدا ہونا ایک نہایت معقول بات ہے۔ قرآن اپنے پیچھے ایک عظیم الشّان تاریخ رکھتا ہے۔ اس کے کارنامے نہایت شاندار ہیں۔ ذہنوں اور دماغوں کی تبدیلی میں اس کتاب نے جو معجزہ دکھایا ہے آج تک کسی کتاب نے بھی یہ معجزہ نہیں دکھایا۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ دنیا کی آبادی کا ایک عظیم حصّہ اس کو نہ صرف کتاب مانتا ہے، بلکہ اس کو خدائی اور آسمانی کتاب مانتا ہے، اس کو لوحِ محفوظ سے اترا ہوا کلام مانتا ہے، ایک ایسا معجز کلام مانتا ہے، جس کی نظیر نہ انسان پیش کر سکتے نہ جنّات پیش کر سکتے ہیں۔ ایک ایسا کلام جس کے ماضی اور جس کے حاضر کے متعلق یہ شہادتیں اور لوگوں کے یہ احساسات موجود ہوں، بہرحال ایک اہمیت رکھنے والا کلام ہے اور آدمی اس کو سمجھنے کا حق اسی وقت ادا کر سکتا ہے جب اس کی یہ عظمت و اہمیت اس کے پیشِ نظر ہو۔ اگر یہ اہمیت اس کے سامنے

نہ ہو تو ممکن نہیں ہے کہ آدمی کا ذہن اس کو اس اہتمام کا مستحق سمجھے جو اہتمام اس کے لیے فی الواقع مطلوب ہے۔ اگر کسی رقبۂ زمین کے متعلق یہ علم ہو کہ وہاں سے سونا نکلتا رہا ہے اور کسی زمانہ میں وہاں سے کافی سونا برآمد ہو چکا ہے تو توقع یہی کی جاتی ہے کہ اگر کھدائی کی جائے تو یہاں سے سونا نکلے گا اور پھر اس کی اسی حیثیت کو پیش نظر رکھ کر اس سے فائدہ اٹھانے کا سر و سامان کیا جاتا ہے اور اس پر محنت صرف کی جاتی ہے۔ لیکن ایک معدن کو اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ یہ ایک گھورا ہے یا یہ کہ اگر یہاں محنت کی جائے تو یہاں سے زیادہ سے زیادہ کوئلہ یا چونا فراہم ہو سکے گا تو اس پر یا تو کوئی سرے سے اپنا وقت ہی ضائع کرنا پسند نہیں کرے گا یا کرے گا تو صرف اس حد تک جس حد تک اس سے اس کو فائدہ پہنچنے کی توقع ہو گی۔

یہ تنبیہ ہم نے اس لیے ضروری سمجھی ہے کہ قرآن مجید کے متعلق ایسی غلط فہمیاں لوگوں کے اندر موجود ہیں جن کے ہوتے ہوئے ممکن نہیں ہے کہ اس کو اس اعتناء و اہتمام کا مستحق سمجھا جائے جو اس سے حقیقی استفادہ کے لیے ضروری ہے۔ یہ غلط فہمیاں قرآن مجید کے ماننے والوں اور اس کے منکروں، دونوں کے اندر موجود ہیں۔ جو اس کے منکر ہیں وہ اس بات کا تو ایک حد تک اعتراف کرتے ہیں کہ ایک خاص دور میں اس کتاب کے ذریعہ سے کچھ اصلاحات واقع ہوئیں، لیکن ان کے خیال میں وہ زمانہ اب گزر چکا۔ عرب کے بدوؤں کے لیے، جن کے مسائل سیدھے سادے تھے، ان لوگوں کے خیال میں، یہ کتاب مفید ہو سکتی تھی، لیکن موجودہ زمانہ کے الجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے کے لیے وہ اس کتاب کو کافی نہیں سمجھتے۔

جو اس کو ماننے والے ہیں ان میں بہت سے لوگ اس کو محض حرام و حلال کے بتلانے کا ایک فقہی ضابطہ سمجھتے ہیں اور فقہ کے احکام علیحدہ مرتب ہو جانے کے بعد ان کی نگاہوں میں اگر اس کی کوئی اہمیت باقی رہ گئی ہے تو صرف تبرک کے نقطۂ نظر سے رہ گئی ہے۔ بہت

سے لوگ اس کو اچھی اچھی نصیحتوں کا ایک مجموعہ سمجھتے ہیں۔ بہت سے لوگ نزع کی سختیوں کے دور کرنے اور ایصالِ ثواب کی کتاب سمجھتے ہیں۔ بہت سے لوگ اس کو دفعِ آفات و بلیات کا تعویذ سمجھتے ہیں۔ اور جس طرح عیسائی دل کے جانب والے جیب میں انجیل رکھے پھرتے ہیں اسی طرح اس خیال کے مسلمان جیب میں قرآن کو رکھتے ہیں۔ اس طرح کی غلط فہمیوں میں پڑے ہوئے مسلمان ناممکن ہے کہ قرآن حکیم سے وہ فائدہ اٹھاسکیں جس کے لیے فی الحقیقت وہ نازل ہوا ہے۔ ان لوگوں کی مثال بالکل ایسی ہے کہ کسی شخص کو ایک توپ دی جائے کہ وہ اس کے ذریعہ سے دشمنوں کے قلعہ کو مسمار کرے لیکن وہ اس کو مچھر مارنے کی ایک مشین سمجھ بیٹھے اور اسی حقیر مقصد کے لیے اس کو استعمال کرنا شروع کر دے۔

قرآن کے تقاضوں کے مطابق بدلنے کا عزم:

قرآن حکیم سے حقیقی استفادہ کے لیے تیسری ضروری چیز یہ ہے کہ آدمی کے اندر قرآن مجید کے تقاضوں کے مطابق اپنے ظاہر و باطن کو بدلنے کا مضبوط ارادہ موجود ہو۔ ایک شخص جب قرآن مجید کو گہری نگاہ سے پڑھتا ہے تو وہ ہر قدم پر یہ محسوس کرتا ہے کہ قرآن کے تقاضے اور مطالبے اس کی اپنی خواہشوں اور چاہتوں سے بالکل مختلف ہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس کے تصورات و نظریات بھی قرآن سے بیشتر الگ ہیں اور اس کے معاملات و تعلقات بھی قرآن کے مقرر کردہ حدود سے ہٹے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے باطن کو بھی قرآن سے دور پاتا ہے اور اپنے ظاہر کو بھی اس سے بالکل منحرف محسوس کرتا ہے۔ اس فرق و اختلاف کو محسوس کرکے ایک صاحبِ عزم اور حق طلب آدمی تو یہ فیصلہ کرتا ہے کہ خواہ کچھ ہو میں اپنے آپ کو قرآن کے تقاضوں کے مطابق بنا کے رہوں گا۔ وہ ہر قسم کی قربانیاں کرکے، ہر طرح کے مصائب جھیل کر، ہر قسم کی ناگواریاں برداشت کرکے اپنے آپ کو قرآن کے مطابق بنانے کی کوشش کرتا ہے اور بالآخر اپنے آپ کو قرآن کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے۔ لیکن جو شخص صاحبِ

عزم نہیں ہوتا ہے وہ اس خلیج کو پاٹنے کی ہمت نہیں کر سکتا جو وہ اپنے اور قرآن کے درمیان حائل پاتا ہے۔ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اگر میں اپنے عقائد و تصورات کو قرآن کے مطابق بنانے کی کوشش کروں تو مجھے ذہنی اور فکری حیثیت سے نیا جنم لینا پڑے گا۔ اسے یہ نظر آتا ہے کہ اگر میں اپنے اعمال و اخلاق کو قرآن کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کروں تو میرا اپنا ماحول میرے لیے بالکل اجنبی بن کے رہ جائے گا۔ اسے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر میں اپنے آپ کو ان مقاصد کی تکمیل میں سرگرم کروں جن کا مطالبہ مجھ سے قرآن کر رہا ہے تو میں جن منافع اور جن لذات سے متمتع ہو رہا ہوں ان سے متمتع ہونا تو الگ رہا عجب نہیں کہ جیل اور پھانسی کی سزاؤں سے دوچار ہونا پڑے۔ وہ یہ دیکھتا ہے کہ اگر میں اپنے وسائلِ معاش کو قرآن کے ضابطۂ حلال و حرام کی کسوٹی پر پرکھوں تو آج جو عیش مجھے حاصل ہے اس سے محروم ہو کر شاید اپنی نانِ شبینہ کے لیے بھی فکرمند ہونا پڑے۔ ان خطروں کے مقابل میں ڈٹ جانا اور ان سے مقابلہ کرنے کے لیے کمرِ ہمت باندھ لینا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ صرف مردانِ کار ہی ان گھاٹیوں کو پار کر سکتے ہیں، معمولی ہمت و ارادہ کے لوگ یہیں سے اپنا رخ بدل لیتے ہیں۔ بعض جو اپنی کمزوریوں پر زیادہ پردہ ڈالنے کے خواہشمند نہیں ہوتے وہ تو یہ کہتے ہوئے اپنے نفس کی خواہشوں کے پیچھے چل کھڑے ہوتے ہیں کہ قرآن مجید کا راستہ ہے تو بالکل صحیح، لیکن ہمارے لیے اس پر چلنا نہایت مشکل ہے، اس لیے ہم اسی راہ پر چلیں گے جس راہ پر ہم کو ہمارا نفس لے جا رہا ہے۔ لیکن جو لوگ اپنی کمزوریوں کو عزیمت اور اپنے نفاق کو ایمان کے روپ میں پیش کرنے کا شوق رکھتے ہیں وہ اپنا یہ شوق مختلف تدبیروں سے پورا کرتے ہیں۔ بعض اضطرار اور مجبوری کے بہانوں سے اپنے لیے ناجائز کو جائز اور حرام کو حلال بناتے ہیں۔ بعض جھوٹی اور باطل تاویلات کے ذریعہ سے باطل پر حق کا ملمع چڑھاتے ہیں۔ بعض وقت کے تقاضوں اور مصالح کی آڑ تلاش کرتے ہیں۔ بعض کتاب الٰہی میں اس قسم کی تحریفیں کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس قسم کی تحریفیں یہود نے اللہ کی کتاب میں کی تھیں۔ بعض کفر و ایمان کے بیچ سے ایک راہ پیدا کرنے کی کوشش

کرتے ہیں یعنی قرآن کے جس حصّہ کو اپنی خواہشوں کے مطابق پاتے ہیں، اس کی تو پیروی کرتے ہیں اور جس حصہ کو اپنی خواہشوں کے مطابق نہیں پاتے اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

یہ ساری راہیں شیطان کی نکالی ہوئی ہیں اور ان میں سے جس راہ کو بھی آدمی اختیار کرے گا وہ اس کو سیدھے ہلاکت کے گڑھے کی طرف لے جائے گی۔ کامیابی اور فلاح کا راستہ صرف یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو قرآن کے سانچہ میں ڈھالنے کی ہمت کرلے اور اس کے لیے ہر قربانی پر آمادہ ہو جائے۔ کچھ عرصہ تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس ارادہ کی آزمائش ہوتی ہے۔ اگر آدمی اس آزمائش میں اپنے آپ کو مضبوط ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے تو پھر اس کے لیے سعادت کی راہیں کھلنی شروع ہو جاتی ہیں۔ اگر ایک دروازہ بند ہوتا ہے تو خدا اس کے لیے دوسرا دروازہ کھول دیتا ہے۔ اگر ایک ماحول سے وہ پھینکا جاتا ہے تو دوسرا ماحول اس کے خیر مقدم کے لیے آگے بڑھتا ہے۔ اگر ایک زمین اس کو پناہ دینے سے انکار کر دیتی ہے تو دوسری سرزمین اس کے لیے اپنی آغوش کھول دیتی ہے۔ اسی حقیقت کی طرف قرآن حکیم نے ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (العنکبوت - ۲۹ : ۶۹)	اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں جھیل رہے ہیں ہم ان پر اپنی راہیں ضرور کھولیں گے اور بے شک اللہ خوب کاروں کے ساتھ ہے۔

تدبّر:

قرآن سے استفادہ کے لیے چوتھی شرط تدبّر ہے۔ اس شرط کا ذکر خود قرآن مجید نے بار بار کیا ہے:

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى	کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے یا

قُلُوبٍ اَقْفَالُهَا ۝ دلوں پر تالے چڑھے ہوئے ہیں!

(محمد - ۴۷: ۲۴)

صحابہ رضی اللہ عنہم جو قرآن کے مخاطبِ اوّل تھے، وہ قرآن مجید کو برابر تدبر کے ساتھ پڑھتے تھے اور جو لوگ جتنا ہی تدبر کرتے تھے وہ اتنے ہی قرآن مجید کے فہم میں ممتاز تھے۔ صحابہ نے قرآن مجید کے مطالعہ کے لیے حلقے بھی قائم کیے تھے جن میں اہلِ ذوق حضرات اکٹھے ہو کر قرآن کا اجتماعی مطالعہ کرتے تھے۔ اس طرح کے قرآنی حلقوں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص دلچسپی تھی۔ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ بعد میں خلفائے راشدین، بالخصوص حضرت عمر رضی اللہ عنہ، اس قسم کے حلقوں سے اور قرآن کے ماہرین سے برابر دلچسپی لیتے رہے۔

محض تبرک کے طور پر الفاظ کی تلاوت کر لینا اور قرآن کے معانی کی طرف دھیان نہ کرنا صحابہ کا طریقہ نہیں ہے۔ یہ طریقہ تو اس وقت سے رائج ہوا ہے جب لوگوں نے قرآن مجید کو ایک صحیفۂ ہدایت کے بجائے حصولِ برکت کی ایک کتاب سمجھنا شروع کر دیا؛ جب زندگی کے مسائل سے قرآن کا تعلق صرف اس قدر رہ گیا کہ دمِ نزع اس کے ذریعہ سے جانکنی کی سختیوں کو آسان کیا جائے اور مرنے کے بعد اس کے ذریعہ سے میت کو ایصالِ ثواب کیا جائے؛ جب زندگی کے نشیب و فراز میں رہنما ہونے کے بجائے اس کا مصرف یہ رہ گیا کہ ہم جس ضلالت کا بھی ارتکاب کریں اس کے ذریعہ سے اس کا افتتاح کریں تاکہ یہ برکت دے کر اس ضلالت کو ہدایت بنا دیا کرے؛ جب لوگوں نے اس کو تعویذ کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا تاکہ جب وہ اپنے شیطانی مقاصد کی تکمیل کے لیے نکلیں تو قرآن ان کی حفاظت کرے کہ اس راہ میں کہیں ان کو کوئی گزند نہ پہنچ جائے۔

دنیا کی شاید ہی کوئی کتاب ہو جس نے قرآن سے زیادہ اس بات پر زور دیا ہو کہ اس کا حقیقی فائدہ صرف اس شکل میں حاصل کیا جا سکتا ہے جب کہ اس کو پورے غور و تدبر کے

ساتھ پڑھا جائے۔ لیکن یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ یہی کتاب ہے جو ہمیشہ آنکھ بند کر کے پڑھی جاتی ہے۔ معمولی سے معمولی چیز بھی آدمی پڑھتا ہے تو اس کے لیے سب سے پہلے وہ اپنے دماغ کو حاضر کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ اس کو سمجھ سکے۔ لیکن قرآن کے ساتھ لوگوں کا یہ عجیب معاملہ ہے کہ جب اس کو پڑھنے کا ارادہ کرتے ہیں تو سب سے پہلے اپنے دماغ پر پٹی باندھ لیتے ہیں کہ مبادا کہیں اس کے کسی لفظ کا مفہوم دماغ کو چھو جائے۔

تفویض الی اللہ:

قرآن مجید سے صحیح فائدہ اٹھانے کے لیے پانچویں شرط یہ ہے کہ اس کی مشکلات میں آدمی بددل اور مایوس ہونے یا قرآن مجید سے بدگمان یا اس پر معترض ہونے کے بجائے اپنی الجھن کو خدا کے سامنے پیش کرے اور اس سے مدد اور رہنمائی طلب کرے۔ قرآن میں آدمی کبھی کبھی ایسا محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک ایسے 'قولِ ثقیل' کے نیچے دب گیا ہے کہ اس بارِ گراں کو اٹھانا اس کے لیے ناممکن ہے۔ اسی طرح وہ کبھی ایسا محسوس کرتا ہے کہ اس کے سامنے کوئی ایسی مشکل آگئی ہے جس کی کوئی ایسی تاویل ممکن ہی نہیں ہے جس پر دل مطمئن ہو سکے۔ اس طرح عملی اور فکری مشکلوں اور الجھنوں سے نکلنے کا صحیح اور آزمودہ راستہ صرف یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ سے دعا کرے اور قرآن مجید پر جما رہے۔ اگر قرآن مجید یاد ہو تو شب کی نمازوں میں قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھے ان شاء اللہ اس کی ساری الجھنیں دور ہو جائیں گی اور حکمتِ قرآن کے ایسے دروازے اس پر کھل جائیں گے کہ پھر اس کو قرآنِ حکیم کی ہر مشکل آسان معلوم ہونے لگے گی۔ مندرجہ ذیل دعا بھی اس طرح کے حالات میں پڑھتے رہنا نہایت نافع ہے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ عَبْدُکَ اِبْنُ	اے اللہ! میں تیرا غلام، تیرے غلام کا بیٹا،
عَبْدِکَ اِبْنُ اَمَتِکَ۔ نَاصِیَتِیْ	اور تیری لونڈی کا بیٹا ہوں۔ میری پیشانی
بِیَدِکَ۔ مَاضٍ فِیَّ	تیری مٹھی میں ہے۔ مجھ پر تیرا حکم جاری ہے

حُكْمُكَ ۔ عَدْلٌ فِيَّ قَضَاؤُكَ.
أَسْأَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ
سَمَّيْتَ بِهٖ نَفْسَكَ
أَوْ أَنْزَلْتَهٗ فِيْ كِتَابِكَ
أَوْ عَلَّمْتَهٗ أَحَدًا مِّنْ
خَلْقِكَ أَنْ تَجْعَلَ الْقُرْآنَ رَبِيْعَ
قَلْبِيْ وَنُوْرَ صَدْرِيْ وَجَلَاءَ
حُزْنِيْ وَذَهَابَ هَمِّيْ وَغَمِّيْ۔

میرے بارہ میں تیرا فیصلہ حق ہے۔ میں تجھ
سے تیرے ہر اس نام کے واسطہ سے جو
تیرا ہے، جس سے تو نے اپنے آپ کو پکارا
ہے، یا جس کو تو نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو
سکھایا ہے یہ درخواست کرتا ہوں کہ تو قرآن
کو میرے دل کی بہار، میرے سینہ کا نور،
میرے غم کا مداوا اور میرے فکر و پریشانی
کا علاج بنا دے۔

تدبّرِ قرآن کے اصول و آداب

بعض طلبہ جو قرآن پر تدبر کر رہے ہیں اور اس کے پورے نظام کو سمجھنا چاہتے ہیں وہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ مطالعۂ قرآن میں کن آداب و امور کا لحاظ ضروری ہے۔ ان کی رہنمائی کے لیے یہ سطریں لکھی جاتی ہیں۔ امید ہے مطالعۂ قرآن کے شائقین ان سے فائدہ اٹھائیں گے۔

نیّت کی درستی:

مطالعۂ قرآن میں سب سے مقدم چیز، جیسا کہ پچھلے باب میں واضح ہو چکا ہے، نیت اور ارادہ کی درستی ہے، نیت اور ارادہ کی درستی کا جو مفہوم بالعموم اس زمانہ میں سمجھا جاتا ہے ہم نے اس سے کسی قدر وسیع مفہوم پیشِ نظر رکھا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ یہاں ہم اس کی تشریح کر دیں۔

موجودہ زمانہ میں علوم کے تدبر و مطالعہ کا ایک خاص ڈھنگ ہے جس کی ایک مقبولِ عام شکل وہ ہے جس کو ہم 'ریسرچ' کے نام سے جانتے ہیں۔ ہر چند کہ یہ چیز کچھ اسی زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، ہر زمانہ میں اہلِ علم و تحقیق کی راہ یہی رہی ہے، لیکن ہماری موجودہ پست حالی نے ہمتیں اس قدر پست کر دی ہیں کہ ہمارے اندر نہ تو اپنی قدیم اولوالعزمیوں کے لیے کوئی احترام باقی رہ گیا ہے، نہ وقت کی راہوں میں ہمت آزمائی کا کوئی حوصلہ۔ ایسی حالت میں لوگوں کو یہ سمجھانا کہ قرآن مجید کا مطالعہ موجودہ زمانہ کی ادّعائی ریسرچ کے

علاوہ کچھ اور بھی چاہتا ہے، ایک انوکھی اور عجیب سی بات ہوگی۔ لیکن چونکہ حقیقتِ حال یہی ہے اس لیے ناگزیر ہے کہ یہ عجیب بات بیان کر دی جائے۔ آج اگرچہ ان باتوں کی قدر کرنے والے تھوڑے نکلیں گے، لیکن اگر کچھ لوگ بھی ایسے نکل آئے جنھوں نے ان کی قدر کی اور مطالعۂ قرآن میں ان کا لحاظ رکھا تو ان شاءاللہ اس سے بڑی برکتیں ہوں گی۔

جہاں تک قرآن مجید کے محلِ فکر و تدبر ہونے کا سوال ہے اس پر کچھ بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جن لوگوں کو دین کے فہم کا کوئی حصہ ملا ہے وہ اس بات پر اتفاق رکھتے ہیں کہ قرآن مجید کے اسرار بغیر فکر و تدبر کے نہیں کھل سکتے۔ لیکن قرآن مجید کے لیے صرف اسی قدر ضروری نہیں ہے کہ اس پر فکر و تدبر کیا جائے، بلکہ اس فکر و تدبر کے کچھ خاص شرائط و آداب ہیں جن کا اہتمام اس راہ میں ضروری ہے اور اگر یہ اہتمام نہ کیا جائے تو یہ تدبر عموماً رائگاں جاتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں باوجودیکہ تدبر قرآن کا ادعا روز بروز بڑھ رہا ہے ہمارے حالات میں کوئی اصلاح نہیں ہو رہی ہے بلکہ اگر غور کیجیے تو نظر آئے گا کہ امید کی وہ ہلکی سی روشنی بھی جو کبھی کبھی ہماری عام مایوسیوں کے اندر نظر آجایا کرتی تھی آہستہ آہستہ غائب ہو رہی ہے اور انتہائی بدقسمتی یہ ہے کہ آج جتنے فتنے اٹھ رہے ہیں وہ زیادہ تر قرآن ہی کے نام سے اُٹھ رہے ہیں، حالانکہ قرآن فتنوں کو مٹانے کے لیے آیا تھا، فتنوں کو ابھارنے اور ان کو غذا دینے کے لیے نہیں آیا تھا۔ لیکن یہ ایک عجیب حقیقت ہے کہ ماضی میں بھی اور آج بھی جتنے فتنے اٹھے یا اٹھ رہے ہیں وہ سب قرآن ہی کی آڑ لے کر نمودار ہوئے۔ خوارج اپنے گمان کے مطابق قرآن مجید ہی کے سہارے ابھرے۔ باطنیوں کے تمام استدلالات کی بنیاد، ان کے خیال میں، قرآن مجید ہی پر ہے۔ بابیوں اور بہائیوں نے جو کچھ کہا، اپنے زعم کے مطابق، قرآن مجید ہی سے کہا۔ قادیانیوں کی نبوت کی اساس، ان کے دعویٰ کے مطابق، قرآن مجید

ہی پر ہے اور چکڑالوی تو قرآن کے سوا کچھ بولتے ہی نہیں اور یہ تو ہزاروں فرقوں اور گروہوں میں سے صرف چند کے نام لیے گئے ہیں۔ تاریخِ اسلام کے تمام فرقوں کے حالات اور ان کے اساسی معتقدات اگر معلوم کیجیے تو قرآن مجید آپ کو ہر ایک کے ہاتھ میں نظر آئے گا۔

سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے ؟ قرآن مجید تو ہدایت اور رہنمائی کی روشنی ہے اس کو ضلالت اور گمراہی کی تاریکی سے کیا تعلق ؟ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جو اس کو دیکھتا اور پڑھتا اس کو ٹھیک راہ مل جاتی، سیدھا راستہ نظر آجاتا، وہ ہدایت و ایمان سے معمور ہو جاتا، ہر گوشہ میں وحدت و یک جہتی کی شاہراہ اس پر کھل جاتی، اختلاف و تفرق کے تمام کج پیچ نکل جاتے اور اس کی تعلیم و دعوت کی ہم آہنگی، غیر مبہم اور پُرزور صدائے اس کے دل و دماغ اس طرح بھر جاتے کہ اس کے علاوہ نہ وہ کچھ سوچ سکتا نہ کچھ سمجھ سکتا۔ مگر ہو یہ رہا ہے کہ اس کو ایک تلوار کی طرح دوست اور دشمن، دونوں استعمال کر رہے ہیں۔ مومن اسی کو لے کر حق و عدل کی حمایت کرتا ہے اور منافق اسی کے ذریعہ سے سچائی اور حقیقت کو مغلوب کر لینا چاہتا ہے۔ آخر قرآن ہر ایک پر کیوں نہیں کھل جاتا؟ اس کی صاف اور واضح تعلیمات ہر ایک کے دل کو کیوں نہیں پکڑ لیتی ہیں؟ اس کی اصلی تعریف تو یہی ہے کہ وہ ہر قسم کے کج پیچ سے پاک ہے، اپنی تعلیمات و توضیحات میں بالکل غیر مشتبہ اور غیر مبہم ہے اور اس کے ہر گوشہ میں کامل توافق، کامل اتحاد، کامل ہم آہنگی اور کامل وحدت نمایاں ہے پھر اس کے مختلف پڑھنے والے مختلف راہوں میں کیوں نکل جاتے ہیں؟ وہ سب کو کھینچ کر ایمان و عقیدہ کی ایک ہی شاہراہ پر کیوں نہیں کھڑا کر دیتا؟

ان سوالوں کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید کے مطالعہ کے کچھ خاص آداب و قواعد ہیں جن کا لحاظ و اہتمام ضروری ہے، ان کے بغیر قرآن کی راہ نہیں کھل سکتی۔ ان میں سب سے مقدم، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، ارادہ اور نیت کی درستی ہے۔ یہ اللہ کی کتاب ہے اور

خلق کی ہدایت کے لیے نازل ہوئی ہے، اس لیے سب سے مقدم یہ ہے کہ انسان بالکل خالی الذہن ہوکر اس کو صرف طلبِ ہدایت کے لیے پڑھے اور اپنے قلب ودماغ کو پورے طور پر اس کے حوالے کر دے، اپنے دل کی باگ اس کے ہاتھ میں دے دے، تمام خیالات و معتقدات سے خالی ہوکر اپنے تئیں اس امر کے لیے آمادہ کرے کہ قرآن کے اندر اپنی خواہشات کے لیے سندِ جواز، اپنے معتقدات کے لیے حیلے اور اپنے نفس کے لیے جائے پناہ نہیں تلاش کرے گا، کج بحثیاں اور اعتراضات نہیں ڈھونڈھے گا، بلکہ تشفی اور طمانیت تلاش کرے گا۔ اس کی روشنی جس طرف رہنمائی کرے گی اسی طرف قدم بڑھائے گا۔ یہ کوشش نہیں کرے گا کہ قرآن مجید کو اپنی خواہشاتِ نفس کے پیچھے لگائے۔ جس شخص کا مقصود طلبِ ہدایت نہ ہو، بلکہ اعتراض اور کج بحثی ہو اور اس کی خواہشوں نے اس کے دل میں جو وسوسے پیدا کر دیے ہوں، قرآن مجید کو ان سے ہم آہنگ کرنا چاہتا ہو اس کے لیے قرآن مجید میں بالکل محرومی ہی محرومی ہے۔ قرآن مجید نے اپنی اس خصوصیت کی طرف خود اشارہ کر دیا ہے:

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ
الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ
هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ
فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ
زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ
مِنْهُ ابْتِغَاۗءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاۗءَ
تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ
اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي
الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ
مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا

وہی ہے جس نے تمہارے اوپر کتاب اتاری جس میں محکم آیات ہیں جو اصل کتاب کا درجہ رکھتی ہیں اور دوسری کچھ آیتیں اس میں ایسی ہیں، جو متشابہ ہیں۔ تو جن کے دلوں میں کجی ہے وہ اس میں متشابہات کے درپے ہوتے ہیں تاکہ فتنہ پیدا کریں اور ان کی حقیقت وماہیت معلوم کریں حالانکہ ان کی اصل حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ تو جو لوگ علم میں راسخ ہیں وہ یوں کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لائے، یہ سب ہمارے رب

يَذَّكَّرُ إِلَّآ أُولُوا الْأَلْبَابِ ○ ہی کے پاس سے ہیں اور یاد دہانی تو اہلِ عقل

(آلِ عمران-۳ : ۷) ہی حاصل کرتے ہیں۔

قرآن میں دو طرح کی آیات :

اجمالاً اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید میں دو طرح کی آیات ہیں : ایک محکمات اور دوسری متشابہات۔ محکمات اپنے مفہوم و مطلب میں بالکل واضح ہیں، ان میں کسی پہلو سے کسی طرح کا اشتباہ نہیں ہے۔ ان کا تعلّق ہماری علمی اور اعتقادی زندگی کے اساسی مسائل سے ہے، اس لیے ہم ان کے تمام پہلوؤں کو اچھی طرح اپنی گرفت میں لے سکتے ہیں اور منطق و استدلال کی تمام کسوٹیوں پر جانچ کر ان کی نسبت اپنے قلب کو ہر طرح مطمئن کر سکتے ہیں۔ متشابہات کا حال ان سے کچھ مختلف ہے۔ اصولی طور پر تو وہ عقل و استدلال کی نہایت محکم بنیادوں پر مبنی ہوا کرتی ہیں اس لیے ان پر اجمالاً ایمان لانے اور یقین کرنے میں عقل کو ذرا بھی الجھن نہیں ہوتی۔ لیکن چونکہ ان کا تعلّق اس عالمِ محسوسات سے ماوراء احوال و امور سے ہوتا ہے، اس وجہ سے ان کی تفصیلات ہماری عقل و منطق کے دائرے میں نہیں سماتیں۔

قرآن پڑھنے والوں کی دو قسمیں :

پھر جس طرح قرآن مجید کی آیتوں کی دو قسمیں ہیں اس طرح قرآن مجید کے پڑھنے والوں کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ لوگ ہیں جو اپنے ارادہ اور نیت کو درست کر کے اس کی طرف بڑھتے ہیں اور ان کا مقصود طلبِ رشد و ہدایت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا ہے۔ قرآن مجید فوراً ایسے لوگوں کا ہاتھ پکڑ کر ان کو اپنی تربیت میں لے لیتا ہے۔ وہ اس کی محکمات میں اپنے روح و قلب کے لیے پوری آسودگی اور اپنی اعتقادی و عملی زندگی کے لیے پوری رہنمائی پاتے ہیں۔ ایک مدّت کی گم گشتگی اور ہرزہ گردی کے بعد ان کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا سکونِ قلب اور طمانیتِ عقل کی بہشت میں پہنچ گئے ہیں۔ ان کے دل کی تمام خلشیں

دور ہو جاتی ہیں، شبہات و شکوک کے تمام کانٹے ایک ایک کر کے نکل جاتے ہیں۔ متشابہات سے ان کے دل میں کوئی وحشت نہیں پیدا ہوتی، کیونکہ اصولی طور پر وہ بالکل عقل و حکمت پر مبنی ہوتی ہیں اور اجمالاً ان پر ایمان لانے میں عقل کو کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی، صرف یہ بات ہوتی ہے کہ ان کی جزئیات کے متعلق کوئی تفصیلی تصور عقل کی گرفت میں نہیں آتا تو یہ ایسی چیز نہیں ہے جو سببِ انکار و اعراض ہو۔ اگر ہمارے پاس ننانوے روپے موجود ہیں تو بہتر ہوگا اگر یہ پورے سو ہو جائیں، لیکن اگر ایسا نہ ہو تو کیا ہم اپنی جیب سے ننانوے روپے پھینک دیں گے؟ پس اس طرح کی آیات کے باب میں وہ خدا کی طرف رجوع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ 'اٰمَنَّا بِہٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا' (ہم ان پر ایمان لائے، یہ سب ہمارے رب ہی کے پاس سے ہیں) اور ان کا یہ کہنا بے وقوفی اور ناسمجھی کی وجہ سے نہیں ہوتا، بلکہ عقل و دانش اور علم کی پختگی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن نے ان کو 'الراسخون فی العلم' (پختہ کارانِ علم) کے عظیم الشان لقب سے پکارا کیونکہ ان کا آیاتِ متشابہات کے متعلق یہ اعتراف درحقیقت کمالِ عقل و حکمت، انتہائے فکر و تدبر اور علم کی پختگی کی سب سے بڑی شہادت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے معاملہ کو، جہاں تک اس کی اصل و بنیاد کا تعلق ہے، اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ اس کے متعلق ان کو کسی طرح کا تذبذب باقی نہیں رہ گیا ہے۔ صرف اس کے بعض گوشوں کے متعلق ان کو شرح صدر کا انتظار ہے سو اس کے لیے وہ امیدوار ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو جلد تشفی و طمانیت سے بہرہ مند فرمائے گا۔ اور اگر کبھی یہ شکوک خلجان اور پریشانی کا سبب ہونے لگتے ہیں اور قلب کی طمانیت میں کچھ فتور نظر آتا ہے تو فوراً وہ دعا ان کی زبان پر جاری ہو جاتی ہے جو اسی آیت کے بعد ہی وارد ہے، یعنی :

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ	اے ہمارے پروردگار! ہمارے دلوں کو ہدایت
اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ	بخشنے کے بعد کج نہ کر اور ہمیں اپنے پاس

لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝ سے رحمت بخش۔ تو نہایت بخشنے

(آل عمران - ۳ : ۸) والا ہے۔

دوسری جماعت اُن لوگوں کی ہے جو اپنے ارادہ و نیت کی اصلاح کیے بغیر محض اپنے اغراض و خواہشات کی تائید ڈھونڈنے کے لیے قرآن پڑھتے ہیں اور بجائے اس کے کہ اپنی باگ قرآن کے ہاتھ میں دے دیں، چاہتے ہیں کہ قرآن کی باگ ہاتھ میں لے کر اس کو جس طرف چاہیں پھیریں۔ ان کا مقصود طلبِ رشد و ہدایت سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے کسی قرار دادہ مسلک کی تائید کے لیے اس میں دلیلیں تلاش کریں، یا جن سے ان کو اختلاف ہے ان کو چپ کرانے کے لیے اس میں اعتراضات اور کج بحثیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالیں۔ ظاہر ہے ایسے لوگ جب قرآن مجید پڑھیں گے تو وہ محکمات پر نہیں ٹکیں گے کیونکہ وہ ان کے مطلب کی چیز نہیں بن سکتی ہیں۔ ان کو تسلی و طمانیت یا عمل و اطاعت کی راہ مطلوب نہیں ہے کہ اس کو پاکر مطمئن ہو جائیں۔ ان کو دراصل ٹھوکروں اور لغزشوں کی تلاش ہے اس لیے پورے قرآن میں صرف وہ بات ان کو پسند آئے گی جس سے اپنی خواہشوں کو تسلی دے سکیں یا اپنے مخالفوں کو چپ کرا سکیں۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کی تلاش یہ ہو گی اس کو قرآن کے محکمات کے ساتھ کوئی دل چسپی نہیں ہو سکتی، ایسے لوگ تو صرف متشابہات کی طرف بڑھیں گے اور جن باتوں کا اجمالاً مان لینا ان کے لیے کافی ہوتا وہ ان کی جزئیات و تفصیلات کے بخیے ادھیڑیں گے اور بالکل یہود کی طرح ــــــ جن کو اس بات پر اعتراض تھا کہ دوزخ کی آگ میں درخت کیسے پائے جا سکتے ہیں اور اس اعتراض کی وجہ سے انہوں نے اپنے اوپر اللہ کی ہدایت کے دروازے بند کر لیے تھے ــــــ یہ لوگ بھی طرح طرح کے شبہات و شکوک پیدا کریں گے اور اس طرح اپنے آپ کو اللہ کی ہدایت سے محروم کریں گے۔

ان لوگوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ اپنے تئیں عقل و دانش کا پتلا سمجھتے ہیں لیکن قرآن نے مندرجہ صدر آیت میں ان کو احمق اور بے عقل قرار دیا ہے۔ اور فی الواقع ان

لوگوں سے بڑھ کر بے وقوف کون ہو سکتا ہے جن کی سب سے بڑی آرزو یہ ہو کہ وہ پورے قرآن میں کوئی ایسی بات پالیں جو ان کی خواہشوں کے سانچہ میں ڈھل سکے یا جس کو بنیاد قرار دے کر وہ قرآن پر اعتراضات کر سکیں۔ اس سے بڑھ کر بے وقوفی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک شخص حکمت کے نو سو ننانوے اصولوں کو اس لیے ٹھکرا دے کہ اس کے ہزارویں اصول کی تمام جزئیات 'پورے طور پر' اس کی گرفت میں نہ آسکیں۔ یہاں 'پورے طور پر' کے الفاظ پر ہم خاص طور پر زور دینا چاہتے ہیں، اس لیے کہ متشابہات عقل اور ادراک سے بالکل خارج نہیں ہوا کرتی ہیں، بلکہ عقل و ادراک کے دائرے کے اندر ہوتی ہیں، البتہ ان کی جزئیات کی تفصیل ہم نہیں سمجھ سکتے، کیونکہ ہمارے علم و مشاہدہ کی تمام معلومات ان کی مثالیں فراہم کرنے سے قاصر ہوتی ہیں۔

یہ اصلاً تو ان محرومین کا بیان ہے جو عہدِ نزولِ قرآن میں موجود تھے، لیکن اگر غور کیجیے تو اس آیت نے ہر دور کے راسخون فی العلم اور اربابِ زیغ کی حقیقت واضح کر دی ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں قرآن کے پڑھنے والے انہی دو گروہوں میں تقسیم رہے ہیں: ایک راسخون فی العلم اور اولوا الالباب؛ دوسرے طالبینِ فتنہ اور اربابِ زیغ۔ ایک گروہ کا اصلی مطمحِ نظر قرآن کا وہ حصہ رہا ہے جو محکمات سے متعلق ہے۔ کیونکہ اس کا مقصود طلبِ رشد و ہدایت تھا۔ اس گروہ نے قرآن سے فیض پایا اور صراطِ مستقیم کی ہدایت حاصل کی۔ دوسرا گروہ اربابِ زیغ و تاویل کا تھا، اس نے قرآن کی طرف ہدایت کے لیے نہیں، بلکہ شرارت کے لیے قدم بڑھائے۔ ان کی نیتیں فاسد اور ان کے ارادے بُرے تھے۔ اس لیے قدرتاً یہ قرآن کے اس حصہ کی کھوج کرید میں مشغول ہو گیا جو متشابہات سے متعلق ہے اور جس میں عقلِ انسانی اگر سنبھل کر نہ چلے اور ہر قدم پر خدا کی توفیق شاملِ حال نہ ہو تو طرح طرح کی ٹھوکریں لگ سکتی ہیں۔

قرآن کو اللہ تعالیٰ نے ایمان و عمل کی تعلیم اور قلب و روح کے تزکیہ کے لیے اتارا ہے،

دماغی عیاشیوں اور کج بحثیوں کے لیے نہیں اتارا ہے۔ اس لیے اس کا فیض صرف انہی لوگوں کو پہنچ سکتا ہے جو اس کے پاس پاک دل اور سننے والے کان لے کر حاضر ہوں، جنگجو دماغ اور اُلجھانے والی عقل لے کر نہ آئیں۔ سورۂ ق میں فرمایا ہے:

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ	بے شک اس میں ان لوگوں کے
كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى	لیے بڑی یاددہانی ہے جن کے پاس دل
السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ ○	ہو یا وہ بات متوجہ ہو کر سننے کے لیے
(قٓ ۔ ۵۰ ۔ ۳۷)	کان لگائیں۔

اور سورۂ صافات میں قلب کے متعلق یہ تصریح فرمائی ہے کہ وہ سلیم ہو: 'اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ' (الصّٰفّٰت ۔ ۳۷ : ۸۴) (جب کہ وہ حاضر ہوا اپنے رب کے حضور میں قلب سلیم کے ساتھ)۔ سورۂ ق میں ہے: 'وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِیْبٍ' (قٓ ۔ ۵۰ : ۳۳) (اور حاضر ہوا متوجہ رہنے والے دل کے ساتھ)۔ ان دونوں لفظوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جو خدا کا کلام سننے کے لیے آئے وہ قلب سلیم اور قلب منیب لے کر آئے۔ متکبّر اور جبّار کا قلب لے کر نہ آئے۔ کیونکہ ایسے دلوں پر اللہ کی مہر ہوتی ہے، وہ خدا کی باتوں کے سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں:

اَلَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْٓ	جو اللہ کی آیات کے باب میں کٹ حجتی
اٰیٰتِ اللّٰهِ بِغَیْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ	کرتے ہیں بغیر کسی دلیل کے جو ان کے پاس
كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ	آئی ہو، اللہ اور اہل ایمان کے نزدیک وہ
الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ یَطْبَعُ	نہایت مبغوض ہیں۔ اسی طرح اللہ مہر کر
اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ○	دیا کرتا ہے ہر متکبّر و جبّار کے دل پر۔
(المؤمن ۔ ۴۰ : ۳۵)	

قرآن کے تدبّر کے پہلے ہی مرحلہ میں جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ

اس کی طرف صرف وہی بڑھنا موجب خیر و برکت ہے جو ایمان اور عمل صالح کے حصول کے لیے ہو۔ اس ایک خواہش کے علاوہ اگر کسی شخص کے اندر کسی دوسری خواہش کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی پایا گیا تو بس قرآن کا دروازہ اس کے لیے بند ہے اور پھر انسانی سعی و کاوش کی کوئی کلید بھی اس بند دروازہ کو نہیں کھول سکتی۔ بات کو سنیئے اور فوراً اس کی طرف عمل اور پیروی کے لیے قدم بڑھا دیجیے تو قرآن خوش ہے اور پھر درجہ بدرجہ ایمان اور عمل کی راہوں میں ہم جس قدر استوار اور مضبوط ہوتے جائیں گے اُسی قدر اس کی برکتیں ہمارے لیے بڑھتی جائیں گی، لیکن اگر ایسا نہیں ہے، ہم قرآن کی باتیں معلوم کرنا چاہتے ہیں مگر ہمتِ عمل نہیں رکھتے، یا اپنی خواہشوں کو اس کے احکام کے آگے ترک نہیں کر سکتے، یا محض اس لیے اس کو پڑھنا چاہتے ہیں کہ ہم کو "تحقیق" اور "ریسرچ" کا مذاق ہے یا ہمارے کچھ اپنے خیالات ہیں جن کے لیے قرآن کی سند ڈھونڈھنا چاہتے ہیں تو ہمارے لیے محرومی کے سوا قرآن میں اور کچھ نہیں ہے۔

قرآن کا قانونِ ہدایت و ضلالت:

اوپر ہم نے دو جماعتوں کا جو ذکر کیا ہے وہ بالکل اصولی تقسیم تھی۔ قرآن مجید نے اس سے زیادہ بسط و تفصیل کے ساتھ ہم کو بتایا ہے کہ کس قسم کے لوگ ہیں جو قرآن سے ہدایت حاصل کرتے ہیں اور کس قسم کے لوگ ہیں جو اس کے فیض سے محروم رہتے ہیں۔

ہدایت و ضلالت کے متعلق ایک اصولی حقیقت تو یہ ہے کہ یہ سرتاسر اللہ کی توفیق اور اس کی توفیق سے محرومی پر منحصر ہے۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرماتا ہے وہ اس کی کتاب سے فیض اٹھاتے ہیں اور جن لوگوں کو وہ اپنی توفیق سے محروم کر دیتا ہے وہ اس فیض سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اس ضابطہ کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

كِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ اِلَيۡكَ لِتُخۡرِجَ   یہ کتاب ہے جو ہم نے تمہاری طرف

النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ	اس لیے اتاری ہے کہ تم لوگوں کو تاریکیوں
بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ	سے نکال کر روشنی کی طرف لاؤ، ان
الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝	کے رب کے اذن سے، خدائے عزیز و
(ابراھیم - ۱۴ : ۱)	حمید کے راستہ کی طرف۔

یعنی قرآن مجید کا مقصد لوگوں کو گمراہی و ضلالت کی تاریکی سے نکال کر ایمان و ہدایت کی روشنی میں لانا ہے اور یہ کام ایک مخصوص قانون کے مطابق انجام پاتا ہے۔ کیونکہ فرمایا ہے: 'بِاِذْنِ رَبِّهِمْ' یعنی پیغمبر کے اختیار میں نہیں ہے کہ وہ جس کو چاہے ایمان و ہدایت بخش دے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، وہ جس کو چاہتا ہے ایمان سے بہرہ ور فرماتا ہے اور جس کو چاہتا ہے گمراہی کے کھڈ میں گرا دیتا ہے اور اس کا یہ چاہنا ایک قانونِ حکمت کے مطابق ہے۔ وہ قانونِ حکمت کیا ہے؟ اس کا جواب قرآن مجید نے متعدد مقامات میں دیا ہے، لیکن سورۂ بقرہ کے آخر میں، تعلیم حکمت کے باب میں، اس پر نسبتاً زیادہ تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ اس لیے ہم اسی مقام کو اس معاملہ کی توضیح کے لیے منتخب کرتے ہیں۔ فرمایا:

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ	اللہ ان لوگوں کا کارساز ہے جو ایمان
مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۗ	لاتے ہیں۔ وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی
وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـــُٔهُمُ	کی طرف لاتا ہے اور جن لوگوں نے کفر
الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ	کیا ہے ان کے کارساز طاغوت بنتے
النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ	ہیں۔ وہ ان کو روشنی سے تاریکیوں کی
اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝	طرف دھکیلتے ہیں۔ یہی لوگ دوزخی
(البقرۃ - ۲ : ۲۵۷)	ہیں، یہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

یعنی اللہ اور اس کی کتاب کی رہنمائی صرف اہل ایمان کے لیے مخصوص ہے، اہل

کفر اس سے محروم ہیں۔ اہلِ کفر کے رہبر و مددگار طاغوت ہیں، وہ ان کو روشنی میں نہیں آنے دیتے، اور اگر کبھی روشنی کی کوئی کرن ان کے سروں پر جھلک بھی جاتی ہے تو ان کے طاغوت فوراً ان کو دھکیل کر تاریکی کے سیاہ پردوں میں چھپا دیتے ہیں کہ کہیں وہ روشنی کے راز سے آشنا نہ ہو جائیں۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی مثال بیان کی ہے جن کو تاریکی سے روشنی کی طرف نکالتا ہے، یا جن کو تاریکی میں چھوڑ دیتا ہے۔ اور اس کے لیے تین شخصوں کو منتخب کیا ہے جو درحقیقت تین جماعتوں کے نمائندے ہیں۔ فرمایا:

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ	کیا تم نے اس کو نہیں دیکھا جس نے
إِبْرٰهِمَ فِي رَبِّهٖٓ أَنْ آتٰىهُ	ابراہیم سے اس کے رب کے باب میں
اللّٰهُ الْمُلْكَ إِذْ قَالَ إِبْرٰهِمُ	اس وجہ سے حجت کی کہ خدا نے اس کو
رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ	اقتدار بخشا تھا، جب کہ ابراہیم نے کہا کہ
قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ قَالَ	میرا رب تو وہ ہے جو زندگی بخشتا اور موت
إِبْرٰهِمُ فَإِنَّ اللّٰهَ يَأْتِي	دیتا ہے، وہ بولا کہ میں بھی زندہ کرتا اور مارتا
بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ	ہوں۔ ابراہیم نے کہا کہ یہ بات ہے تو اللہ
بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ	سورج کو پورب سے نکالتا ہے تو اسے پچھم
الَّذِي كَفَرَ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي	سے نکال دے تو وہ کافر یہ سن کر بھونچکا رہ
الْقَوْمَ الظّٰلِمِينَ أَوْ كَالَّذِي	گیا اور اللہ ظالموں کو راہ یاب نہیں کرتا۔
مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ	یا جیسے کہ وہ جس کا گزر ایک بستی پر ہوا جو اپنی
عَلٰى عُرُوشِهَا قَالَ أَنّٰى	چھتوں پر گری پڑی تھی، اس نے کہا کہ بھلا
يُحْيِي هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ	اللہ اس کو اس کے فنا ہو چکنے کے بعد کس
مَوْتِهَا فَأَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ	طرح زندہ کرے گا؟ تو اللہ نے اس کو

عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ
لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا
اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ
لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ
اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ
يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ
وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى
الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ
نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَيَّنَ
لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى
كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ وَاِذْ قَالَ
اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ
الْمَوْتٰى ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ
قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ
قَلْبِيْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً
مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ
ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ
مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ
يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ؕ وَاعْلَمْ اَنَّ
اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

(البقرة ۲: ۲۵۸ - ۲۶۰)

سو سال کی موت دے دی، پھر اس
کو اٹھایا۔ پوچھا: کتنی مدت اس حال
میں رہے؟ بولا: ایک دن یا ایک دن کا
کچھ حصہ۔ فرمایا: بلکہ تم پورے سو سال اس
حال میں رہے۔ اب تم اپنے کھانے پینے
کی چیزوں کی طرف دیکھو، ان میں سے
کوئی چیز بُسی تک نہیں۔ اور اپنے گدھے
کو دیکھو، ہم اس کو کس طرح زندہ کرتے ہیں
تاکہ تمہیں اٹھائے جانے پر یقین ہو اور تاکہ
ہم تمہیں لوگوں کے لیے ایک نشانی بنائیں
اور ہڈیوں کی طرف دیکھو، کس طرح ہم ان
کا ڈھانچہ کھڑا کرتے ہیں، پھر ان پر گوشت
چڑھاتے ہیں۔ پس جب اس پر حقیقت
اچھی طرح واضح ہو گئی وہ پکار اٹھا کہ میں
مانتا ہوں کہ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے
اور یاد کرو جب کہ ابراہیم نے کہا کہ اے میرے رب!
مجھے دکھا دے تُو مردوں کو کس طرح زندہ کرے
گا؟ فرمایا: کیا تم اس بات پر ایمان نہیں رکھتے؟
بولا: ایمان تو رکھتا ہوں، لیکن چاہتا ہوں کہ
میرا دل پوری طرح مطمئن ہو جائے۔ فرمایا: تو چار
پرندے لو اور ان کو اپنے سے ہلا لو، پھر ان کو

ٹکڑے کرکے ہر پہاڑی پر ان کا ایک حصہ رکھ دو،

پھر ان کو بلاؤ وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے

آئیں گے اور یاد رکھو کہ اللہ غالب اور حکیم ہے"

یہاں ان واقعات کی توضیح کا موقع نہیں ہے جن کی طرف یہ آیات اشارہ کر رہی ہیں ہم صرف اس حقیقت کو معلوم کرنا چاہتے ہیں جو ان آیات کے اندر مضمر ہے اور جس کی طرف نظم کلام رہنمائی کر رہا ہے۔ یہ آیتیں ماسبق آیت: اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ... الآیۃ، کے بعد ہی وارد ہیں۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ کون لوگ ہیں جو تاریکی سے روشنی کی طرف آتے ہیں اور کون لوگ ہیں جو روشنی سے تاریکی کی طرف جاتے ہیں۔ پس نظم اور اسلوبِ کلام "اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ" (کیا تم نے اس کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے اس کے رب کے باب میں حجت کی) دونوں مقتضی ہیں کہ ان آیات کا تعلق ماسبق آیت سے ہو۔ پھر جب ہم ان آیات کے مضمون پر نگاہ ڈالتے ہیں تو معاملہ بالکل صاف ہو جاتا ہے کہ آیتِ ماسبق میں جس بات کو اجمال کے ساتھ بیان فرمایا تھا ان آیات میں اسی کو پوری وضاحت، بلکہ تمثیل کے ساتھ سمجھا دیا ہے کہ کس قسم کے لوگ ہیں جو خدا کی روشنی سے محروم رہتے ہیں اور کون لوگ ہیں جو اس کی ہدایت سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ اب آیئے ان آیات کو اچھی طرح تحلیل کر کے سمجھیں۔ ان میں غور کرنے سے تین شخصوں کا بیان معلوم ہوتا ہے:

ایک وہ شخص ہے جو حکومت، دولت اور ملک و سلطنت کے نشہ سے مخبوط ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کے سامنے اللہ کی روشنی پیش کی ہے۔ لیکن وہ غرور کی بدمستی میں کسی بات پر غور کرنا نہیں چاہتا بلکہ حضرت ابراہیمؑ کی بات پر فوراً معارضہ کر بیٹھتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے معارضہ کا نہایت معقول جواب دیتے ہیں اور وہ ان کے جواب سے لاجواب بھی ہو جاتا ہے، لیکن پھر بھی اس

پر ایمان و ہدایت کی راہ نہیں کھلتی کیونکہ اللہ تعالیٰ کی روشنی طلب گاروں اور ڈھونڈنے والوں کے لیے ہے۔ جو اس سے معارضہ کرتے ہیں ان کی آنکھیں اس سے چندھیا تو جاتی ہیں، لیکن اس سے ان پر ایمان کی راہ نہیں کھلتی: وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ۔

(۲) دوسرا وہ شخص ہے جو علم و ایمان اور یقین و بصیرت کا طلب گار ہے اور ان چیزوں کے حاصل کرنے کے لیے وہ اس طریقہ پر گامزن ہے جو اہلِ حق کا طریقہ ہوتا ہے۔ وہ علم کے جھوٹے مدّعیوں اور مناظرہ بازوں کی طرح بستیوں، مدرسوں، مسجدوں اور خانقاہوں میں مباحثے اور مناظرے کی مجلسیں نہیں منعقد کرتا پھرتا اور نہ یہ کرتا ہے کہ جو خطرہ دل میں گزر جائے اس کو جھٹ چند ورقوں میں چھاپ کر ساری دنیا میں اپنے علم و فضل کا ڈھنڈورا پیٹنے کی کوشش کرے، بلکہ سوچنے والے دماغ اور غور کرنے والی طبیعت کی طرح وہ خلوت کے گوشوں اور تنہائی کے ویرانوں کا شائق ہے، وہ بستیوں کے ہجوم سے بھاگتا اور شہروں کے اژدحام سے گھبراتا ہے اور چاہتا ہے کہ کسی مقامِ عبرت و موعظت کا کوئی خلوت کدہ میسر آجائے تو اپنے ان سوالوں کو لے کر بیٹھ جائے جن کے جواب کے لیے وہ ہمہ وقت تشنہ و بے قرار ہے۔ چنانچہ اسی طرح کی کسی ڈھئی ہوئی بستی پر اس کا گزر ہو جاتا ہے۔ اس کی منہدم دیوار، اس کے ٹوٹے ہوئے در، اس کی سربسجود محرابیں، اس کی پراگندہ اینٹیں اور اس کی وحشت و ویرانی کی خاموشی اس کے سامنے عبرتوں اور بصیرتوں کا ایک دفتر کھول دیتی ہے اور طبیعت کا ذوق فوراً اپنے لیے فکر و نظر کا موضوع تلاش کر لیتا ہے اور جس سوال پر دماغ بار بار زور آزمائی کر کے عاجز آچکا تھا، لیکن کوئی تشفی بخش حل نہ پا سکا تھا، موقع و ماحول کی تاثیر سے دل کا وہی داغ پھر ابھر آتا ہے، تذبذب کی خلش اور اضطراب کی چبھن پھر تازہ ہو جاتی ہے اور وہ انکار و ہٹ دھرمی کے غرور کے ساتھ نہیں، بلکہ یکسر ذوقِ جستجو اور سراپا شوق و آرزو ہو کر پکار اٹھتا ہے: اَنّٰی یُحْیٖ ھٰذِہِ اللّٰہُ بَعْدَ مَوْتِھَا (البقرۃ - ۲: ۲۵۹) (بھلا اللہ اس کو اس کے فنا ہو

چکنے کے بعد کس طرح زندہ کرے گا؟) -

اگرچہ سوال وہی ہے جو مکّہ کے مغروروں اور طائف کے سرکشوں نے کیا تھا اور جس کے جواب میں قرآن نے ان کو جھڑکی سنائی تھی، لیکن سوال کرنے والے کے باطن کی ذہنیت بالکل مختلف ہے ۔ وہاں انکار کا گھمنڈ تھا، یہاں تواضع کی مسکینی ہے۔ وہاں مناظرہ ومجادلہ کا دلولہ تھا، یہاں سوال کی خلش اور اضطراب کی چبھن ہے۔ وہاں حریف کو چپ کرنے کی خواہش کارفرما تھی، یہاں درمان درد اور مرہم زخم مطلوب ہے۔ یعنی وہ تکذیب تھی یہ سوال ہے۔ وہ انکار تھا، یہ شک ہے، اور ان دونوں میں آسمان وزمین کا فرق ہے۔

چنانچہ اس شخص کے ساتھ بالکل مختلف معاملہ ہوتا ہے۔ اس کے شک کے ازالہ کے لیے اسباب کے تمام پردے ہٹا دیے جاتے ہیں، اور ایک ایسی صورتِ حالات سامنے آجاتی ہے جو شک کے ایک ایک کانٹے کو چن چن کر نکال دیتی ہے اور وہ یقینِ کامل کی روشنی سے معمور ہو کر پکار اٹھتا ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے: فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (البقرۃ - ۲ : ۲۵۹) (پس جب اس پر حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی وہ پکار اٹھا کہ میں جانتا ہوں کہ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے) ۔

(۳) اس کے بعد تیسرے شخص حضرت ابراہیم علیہ السلام نمودار ہوتے ہیں۔ یہ فرماتے ہیں: اے پروردگار! مجھے تو دکھا دے کہ تو مردوں کو کیسے زندہ اٹھا کھڑا کرے گا؟ سوال ہوتا ہے کہ کیا تم اس بات پر ایمان ویقین نہیں رکھتے؟ فرماتے ہیں ایمان ویقین تو ہے، بھلا ایمان ویقین کیوں نہ ہوگا، تیرے علم وقدرت سے کیا بعید ہے، تُو تو سب کچھ کر سکتا ہے، لیکن اے رب، میں ایمان ویقین سے کچھ زیادہ چاہتا ہوں، میں شرحِ صدر کا بھوکا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ انوارِ بصیرت کے دریا میں ڈوب جاؤں۔ میرا سینہ آفتابِ یقین وطمانیت کا ایک ابدی ودائمی مطلع بن جائے، میں جو کچھ بصیرت سے سمجھا ہوں، اس کو بصارت

سے بھی دیکھ لوں، اس کی معرفت میں بالکل غرق ہو جاؤں، اس کے رنگ میں بالکل رنگ جاؤں؛ لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِي (البقرۃ - ۲ : ۲۶۰) (چاہتا ہوں کہ میرا دل پوری طرح مطمئن ہو جائے)۔

یہ حالت اوپر کی دونوں حالتوں سے مختلف ہے۔ یہ نہ تو انکار اور غرور کی حالت ہے، نہ شک واضطراب کی بلکہ یہ شرحِ صدر کی طلب ہے، اور اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ایسا معاملہ کرتا ہے کہ ان کا دل اطمینان ویقین کی دولت سے مالا مال ہو جاتا ہے اور ان کی بصیرت کے سامنے سے تمام حجابات یک قلم ہٹ جاتے ہیں۔

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ یہ تین شخص درحقیقت تین جماعتوں کے نمائندے ہیں اور خدا کی روشنی ان تینوں جماعتوں کے ساتھ تین مختلف قسم کے معاملے کرتی ہے۔ ایک جماعت متکبرین کی ہے۔ ان کی نگاہوں کو نورِ الٰہی صرف خیرہ کر دیتا ہے، ایمان وبصیرت نہیں بخشتا۔ دوسری جماعت اربابِ شک واضطراب کی ہے۔ خدا کی روشنی ان کو تشفی وطمانیت بخشتی ہے۔ تیسری جماعت طالبینِ شرحِ صدر کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے سینوں کے دروازے کھول دیتا ہے۔

یہ عام سنت اللہ کا بیان ہے۔ شقاوت وسعادت اور ہدایت وضلالت کا وہ قانون جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، یہی ہے اور بالکل ٹھیک یہی حالت قرآن مجید کے فکر وتدبر میں ایک طالبِ قرآن کو پیش آتی ہے۔ اگر ایک شخص قرآن مجید سے جھگڑنا چاہتا ہے اور یہ حوصلہ لے کر اٹھے کہ اس کی دلیلوں سے لڑائی لڑے گا اور اس کی نصیحتوں سے جھگڑے گا تو اللہ تعالیٰ اس پر قرآنی ہدایت کا دروازہ بند کر دیتا ہے لیکن اگر کوئی شخص ایسا ہے جو کسی شک وشبہ کی خلش سے بے چین ہے اور چاہتا ہے کہ قرآن اس کے شبہات دور کر دے تو قرآن اس کی رہبری کرتا ہے اور آہستہ آہستہ اس کو یقین وبصیرت کی منزل تک پہنچا دیتا ہے۔

قرآن مجید اور صاحبِ وحی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ابتدائی احوال اس حقیقت کو پوری طرح کھول دینے کے لیے بالکل کافی ہیں۔ نبوت سے قبل، لیکن بعثت کے بالکل قریب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال تھا؟ ایک گمراہ اور آوارہ دنیا کے اندر، جس کے اوپر اور نیچے صرف تاریکی ہی تاریکی چھائی ہوئی تھی، آپ ایک روشنی کے لیے بے قرار تھے، ایسی روشنی جو ہدایت و نجات کی بند راہوں کو دنیا کے لیے کھول دے، جو عقل و دل کی بصیرتوں کو جگمگا دے، جو شبہات کی تاریکیوں کو مٹا دے اور اس کائنات کے معمہ کو، جس پر ہزارہا حجابات اور پردے پڑے ہوئے ہیں، حل کر کے سمجھا دے۔ اندرونی خلشوں اور باطنی کاوشوں نے آپ کو یکسر درد بنا دیا تھا، آپ سراپا طلب و جستجو اور یکسر شوق و آرزو ہو کر، بستی سے متنفر اور آبادی سے بیزار ہو گئے تھے۔ ایک صحرا کے اندر، ایک پہاڑ کے غار میں معتکف ہو کر منتظر تھے کہ سامنے کے پردے چاک ہوں، اور حقیقت منتظر جلوہ آرا ہو۔ طلب و جستجو کی یہ نیازمندی، شوق و آرزو کی یہ فروتنی اور فکر و تدبر کی یہ خلوت گزینی اور غار نشینی تھی جب اِقْرَأْ کا پیام آیا اور خدا نے اپنے سر بزانو بندہ کو اٹھایا اور اس پر اپنے فضل کا یوں اظہار فرمایا: وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (الضحیٰ-۹۳:۷) (کیا اس نے تجھے جویائے راہ پایا تو راہ نہ دکھائی!)۔

پس طالبِ قرآن کی ابتدا اور انتہا، دونوں صرف طلب و جستجو اور عجز و فروتنی ہے۔ بے نیازی، استکبار، مجادلہ اور معارضہ کے ساتھ اس سفر کی ایک منزل بھی طے نہیں ہو سکتی۔ قرآن کی طرف آدمی کا قدم صرف اس لیے اٹھنا چاہیے کہ اس کو حقیقت کی طلب ہے اور جب تک حقیقت نہ مل جائے طالب کو چاہیے کہ وہ قرآن کے اندر معتکف رہے اور فکر و تدبر کا جہاد جاری رکھے۔ شبہات کتنے ہی اہم ہوں اور مشکلات کتنی ہی کٹھن، لیکن ایک لمحہ کے لیے بھی مایوس نہ ہو۔ جو شخص خلوصِ نیت کے ساتھ طلبِ علم اور جستجوئے رشد و ہدایت کی راہ میں جہاد کر رہا ہے، اس کی کامیابی یقینی ہے: وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا

فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ‘ (العنکبوت - ۲۹ : ۶۹) (اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں جھیل رہے ہیں ہم ان پر اپنی راہیں ضرور کھولیں گے)۔ اس کے اطمینان و بصیرت کے لیے خدائے کارساز و کریم دشوار کو سہل، بلکہ ناممکن کو ممکن کر دے گا اور اس کو ہدایت و ایمان کی غذا اُس گوشہ سے ملے گی جس گوشہ کا اس کو کبھی وہم و گمان بھی نہ گزرا ہو گا: ’وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ‘ (الطلاق - ۶۵ : ۳) (اور اللہ ان کو وہاں سے رزق دے گا جہاں سے ان کو گمان بھی نہ ہو گا)۔

اور پھر اگر قرآن پر آدمی ثابت قدم رہے تو وہ نعمتِ عظمیٰ جس کو ہم نے شرحِ صدر سے تعبیر کیا ہے اور جس کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواہش کی تھی وہ بھی اس کو ملتی ہے چنانچہ قرآنی تعلیمات کے ظہور و کمال کے بعد اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا: ’أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ‘ (الم نشرح - ۹۴ : ۱) (کیا ہم نے تمہارا سینہ کھول نہیں دیا!)۔

اس سلسلہ کی ایک نہایت لطیف حقیقت سورۂ مجادلہ میں بیان ہوئی ہے۔

اس میں اللہ تعالیٰ نے دو جماعتوں کا ذکر فرمایا ہے۔ ایک جماعت کا حال یہ ہے کہ جب ہی احوال و معاملات میں اس کو کوئی مشکل، کوئی دشواری، کوئی شبہ یا کوئی رکاوٹ پیش آتی ہے تو وہ خدا سے مجادلہ اور رسول سے شکوہ کرتی ہے۔ لفظ مجادلہ، عربی زبان میں جس طرح جھگڑنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اسی طرح اس اصرار کے لیے بھی بولا جاتا ہے جس کی بنیاد محبت، اعتماد اور خلوص پر ہو۔ یعنی وہ جماعت خدا اور رسول پر اعتراض یا نکتہ چینی نہیں کرتی اور نہ قرآن و حدیث کا مذاق اڑاتی، بلکہ اپنے شبہات و شکوک، محبت و اعتماد کے ساتھ عرض کرتی ہے اور ان کا حل چاہتی ہے۔ دوسری جماعت وہ ہے جس کی خصوصیت محادّۃ ہے۔ محادّۃ کے معنی اختلاف کے ہیں۔ یعنی اس کی اصلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ خدا اور رسول کی مخالفت، اور ان کی باتوں پر طرح طرح کی نکتہ چینیاں اور قسم قسم کے شبہات وارد کرے

پہلی جماعت کی نمائندہ ایک عورت ہے، جو ایک مخصوص دینی معاملہ کی وجہ سے سخت کش مکش میں پڑ گئی ہے۔ لیکن بجائے اس کے کہ وہ اس کش مکش کو مذہب پر زبان درازی کا بہانہ بنالے، اپنی مشکل کو نہایت لجاجت اور عاجزی کے ساتھ خدا اور رسول کے حضور میں عرض کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی عرض کو سنتا ہے اور اس کی مشکل کو دور کر دیتا ہے:

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ	اللہ نے سن لی اس عورت کی بات جو
تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِیْۤ	تم سے جھگڑتی تھی اپنے شوہر کے بارے
اِلَى اللّٰهِ ۖۗ وَاللّٰهُ یَسْمَعُ	میں اور شکوہ کر رہی تھی اللہ سے اور اللہ
تَحَاوُرَكُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ	سن رہا تھا تم دونوں کی گفتگو۔ اللہ
بَصِیْرٌ ۝	سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

(المجادلۃ - ۵۸ : ۱)

دوسری جماعت منافقین کی ہے۔ ان لوگوں کا یہ حال ہے کہ وہ ہمیشہ اس گھات میں رہتے ہیں کہ کوئی بات اعتراض اور نکتہ چینی کی پائیں اور اس کو لے اڑیں۔ ان کی نسبت فرمایا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَ	جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے خلاف
رَسُوْلَهٗ كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ	محاذ آرائی کر رہے ہیں وہ ذلیل ہوں
الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَقَدْ	گے جس طرح ان سے پہلے ان کے ہم مشرب
اَنْزَلْنَاۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ ؕ وَ	ذلیل ہوئے۔ اور ہم نے نہایت واضح
لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ ۝ۚ	تنبیہات اتار دی ہیں اور کافروں کے لیے
(المجادلۃ - ۵۸ : ۵)	نہایت سخت ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔

سورۂ مجادلہ کے اندر ان دونوں جماعتوں کا ذکر دو مقابل جماعتوں کی حیثیت سے آیا ہے اور اس کا مقصود محض لوگوں کو اس بات کی تعلیم دینا ہے کہ خدا اور رسول کے ساتھ

معاملہ کرنے کا طریقہ عرض و معروض اور شکوہ والتجا ہے، نہ کہ محادّہ اور مشاقہ، پس خدا کے دین، یا اس کی کتاب میں اگر کوئی مشکل پیش آئے تو اس کی راہ صرف یہی ہے کہ اس کو خدا ہی کے سامنے پیش کرے اور اسی سے تسلی و تشفی اور فتحِ باب کا متمنی ہو۔ یہ نہ کرے کہ جھٹ اس کو ذریعۂ اعتراض و نکتہ چینی بنا کر ایک نیا دین کھڑا کر دے، یا اس کو تراش خراش کر اپنی خواہشوں کے سانچے میں ڈھال دے۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں ان پر قرآن کی راہ نہیں کھلتی۔ وہ یا تو کتاب الٰہی پر نکتہ چینی کرتے کرتے اس سے اس قدر دور ہو جاتے ہیں کہ پھر اس کی طرف لوٹنے کا ان کے لیے امکان ہی نہیں باقی رہ جاتا، یا قرآنی آیات کی تراش خراش کے معاملہ میں وہ اس قدر چابک دست ہو جاتے ہیں کہ آہستہ آہستہ قرآن کی ہر بات کو اپنی خواہشوں کا جامہ پہنا دیتے ہیں اور ان پر بالکل وہ حالت طاری ہو جاتی ہے جو یہود پر طاری ہو چکی تھی کہ انھوں نے خدا کی ساری کتاب کو اپنی خواہشات کا مجموعہ بنا کر رکھ دیا۔

تقویٰ اور عمل :

قرآن مجید کے فہم و تدبر کے لیے ایک نہایت اہم اور ضروری شرط تقویٰ بھی ہے سورۂ بقرہ کی پہلی ہی آیت میں فرمایا ہے :

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۙ
(البقرۃ - ۲ : ۲)

یہ کتابِ الٰہی ہے اس کے کتابِ الٰہی ہونے میں کوئی شک نہیں، ہدایت ہے خدا سے ڈرنے والوں کے لیے۔

سورۂ لقمان میں فرمایا ہے :

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۙ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ ۙ
(لقمان - ۳۱ : ۲ - ۳)

یہ پُرحکمت کتاب کی آیات ہیں، ہدایت و رحمت بن کر نازل ہوئی ہیں خوب کاروں کے لیے۔

اس مضمون کی آیتیں قرآن مجید میں بے شمار ہیں اور ایک طالب علم کو ہر جگہ یہ بات کھٹکتی ہے کہ قرآن مجید کی ہدایت متقین و محسنین ہی کے لیے کیوں مخصوص ہوئی؟ جو شخص بھی اس کو پڑھے، چاہیے کہ قرآن اس کی ہدایت کرے، عام اس سے کہ وہ متقی ہو یا غیر متقی، شقی ہو یا سعید، محسن ہو یا غیر محسن ؛ لیکن قرآن مجید کو اس بات پر اصرار ہے کہ اس کا دروازہ صرف انہی لوگوں کے لیے کھلے گا جو تقویٰ اور احسان کی صفتوں سے متصف ہوں گے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ یہ بات ہمارے مفسرین کو کھٹکی ہے اور انہوں نے اس کو حل کرنے کی کوشش بھی کی ہے، لیکن معاملہ کا ایک خاص پہلو ہے جس کی طرف لوگوں نے توجہ نہیں کی اور اصل حقیقت اس وقت تک بے نقاب نہیں ہوسکتی جب تک اس کو اچھی طرح نہ سمجھ لیا جائے۔

قرآن مجید کے متعلق یہ امر مسلّم ہے کہ وہ انسان کے روحانی ارتقاء کا آخری زینہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت و رہنمائی درجہ بدرجہ فرمائی ہے۔ ہدایت کا پہلا درجہ ہدایتِ جبلت اور ہدایتِ فطرت ہے جس کا ذکر 'اَلَّذِیْ قَدَّرَ فَھَدٰی' (الاعلیٰ۔ ۸۷:۳) (اور جس نے مقدر کیا اور ہدایت بخشی) اور 'فَاَلْھَمَھَا فُجُوْرَھَا وَ تَقْوٰھَا' (الشمس۔ ۹۱ : ۸) (پس اس کو سمجھ دی اس کی بدی اور نیکی کی) وغیرہ مختلف آیات میں فرمایا ہے۔ یہ آنکھ، کان، دماغ اور دل کی رہنمائی اور وجدان و ذوق اور ادراک و تعقّل کی ہدایت ہے۔ یہ فطرت کی وہ عام بخشش ہے جس میں تمام بنی آدم یکساں شریک ہیں۔ بلکہ اس کے ایک حصہ کا فیضان تو اس قدر عام ہے کہ حیوانات تک اس سے بہرہ مند ہیں۔ یہ اسی ہدایت کا ثمرہ ہے کہ مرغی کے بچے دانہ چگتے ہیں، بط کے بچے انڈے سے نکلتے ہی پانی میں تیرنے لگتے ہیں، بلّی کے بچے، ابھی آنکھیں نہیں کھلی ہیں، لیکن جانتے ہیں کہ ان کی غذا کا سرچشمہ اور پرورش کا سامان کہاں ہے۔ انسان اس مرحلہ میں حیوانات کے بالکل ساتھ ساتھ ہے، لیکن اس کو شرف و امتیاز کا ایک خاص درجہ بھی حاصل ہوا ہے یعنی وہ وجدان و ذوق اور ادراک و تعقّل کے شرف سے بھی ممیّز ہے۔ اس کی فطری رہنمائی

صرف اسی قدر نہیں ہے کہ وہ کھالے، پی لے، اور سو رہے۔ بلکہ ان کی مدد سے وہ اپنے کاموں میں ایک نظم و ترتیب پیدا کرتا ہے، جزئیات سے کلیات بناتا ہے، برے اور بھلے میں امتیاز کرتا ہے اور اختیار و ارادہ کی آزادی اور اپنی ذاتی قوتِ فیصلہ سے شر کو چھوڑتا اور خیر کو اختیار کرتا ہے۔

اس مرحلہ کے بعد ہدایت و رہنمائی کا دوسرا درجہ ہے جو انبیاء و رسل کی بعثت سے ظہور میں آیا ہے۔ اس مرحلہ میں انسان کو جو کچھ ملتا ہے وہ تمام تر انہی کلیات و مبادی پر مبنی ہے جن سے وہ ہدایت کے پہلے درجے میں سرفراز ہوا ہے۔ جس طرح بیج کے چند دانوں سے ہم ایک پورا لہلہاتا ہوا چمن تیار کر لیتے ہیں یا چند گٹھلیوں کو بو کر ایک پورا سرسبز و شاداب باغ اگا لیتے ہیں اسی طرح کشتِ فطرت کے چند دانوں کو بارانِ رحمت کی پرورش، باغبانِ فطرت کی رکھوالی اور انبیاء و رسل کی سعی و کاوش نے ایک چمن بنا دیا اور اس کا نام شریعت ہوا۔

لیکن فطرت کے اس عام دستور کے مطابق، جو اس کے تمام کاروبار کی خصوصیت ہے یہ کام بتدریج عمل میں آیا، ایک ہی مرتبہ میں انجام نہیں پا گیا۔ پہلے کچھ انبیاء آئے جنہوں نے فطرت کی زمین کو ہموار کیا۔ پھر دوسرے آئے جنہوں نے اس زمین پر ایک داغ بیل ڈالی، پھر اور لوگ آئے جنہوں نے اس داغ بیل پر بنیادیں استوار کیں، پھر اور آئے جنہوں نے ان بنیادوں پر دیواریں بلند کیں، پھر اللہ تعالیٰ نے اُن کو بھیجا جنہوں نے اس عمارت کو مسقّف کیا یہاں تک کہ عمارت تیار ہو گئی۔ لیکن کونے میں ایک آخری اینٹ کی جگہ خالی رہ گئی اور وقت آگیا کہ وہ بھی اپنی جگہ پر رکھ دی جائے۔ چنانچہ وہ بھی اپنی جگہ پر رکھ دی گئی اور اعلان کر دیا گیا کہ:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ	اب میں نے تمہارے لیے تمہارے دین
وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِىْ وَ	کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کردی
رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ	اور تمہارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت

(المائدۃ - ۵ : ۳) سے پسند فرمایا۔

اس عمارت کا نام اسلام ہوا اور اس کا جامع اور مکمل نقشہ ہمارے ہاتھوں میں قرآن مجید ہے۔ یہ قرآنِ مجید جب اوّل اوّل دنیا کے سامنے آیا تو مندرجہ ذیل تین جماعتوں کو اس نے براہِ راست مخاطب کیا:

۱۔عرب ـــــــ جن میں بیشتر مشرک تھے، لیکن کچھ ایسے بھی تھے جو دینِ ابراہیمی کی فطری سادگی پر قائم تھے۔

۲۔یہود ـــــــ جو اپنی مسلسل شرارتوں اور سرکشیوں کی وجہ سے بالکل مسخ ہو چکے تھے۔صرف ایک چھوٹی سی جماعت ان کے اندر حق پر باقی رہ گئی تھی۔

۳۔ نصاریٰ ـــــــ ان کو بھی ان کے اگلوں کی کج رویوں نے گمراہ کر دیا تھا۔صرف تھوڑے سے لوگ رہ گئے تھے جو صحیح دینِ مسیح پر قائم تھے۔

ان تینوں جماعتوں میں سے قرآن مجید نے سب سے پہلے عربوں کو مخاطب کیا۔عربوں کی عام اخلاقی زندگی بعض فطری فضائل و محاسن سے خالی نہ تھی، لیکن یہ اپنے پیچھے شرک و بت پرستی کی ایک طویل تاریخ رکھتے تھے جس میں ان کی طبیعت اور دماغ کا سانچہ اس قدر بدل چکا تھا کہ قرآن مجید کی تعلیمات، جو سرتاسر فطری سادگی کے حسن و جمال سے آراستہ تھیں، ان میں بڑی مشکل سے سما سکتی تھیں۔ چنانچہ ان کا بڑا طبقہ عرصہ تک قرآن کی تعلیمات سے نہ صرف بیگانہ رہا، بلکہ اس کے مٹانے کے لیے پوری طرح زور لگاتا رہا۔ البتہ ان لوگوں کو قرآن مجید کے قبول کر لینے میں کوئی زحمت نہیں پیش آئی۔ جو دینِ ابراہیمی کی فطری سادگی پر قائم اور شرک و بت پرستی سے پہلے ہی سے بیزار تھے انھوں نے قرآن مجید کی دعوت سنی تو ان کو ایسا محسوس ہوا کہ گویا اپنے ہی دل کی آواز سن رہے ہیں۔پس وہ اس کی طرف لپکے اور اس کو قبول کر لیا۔ان کو نہ تو معجزات کی ضرورت پیش آئی اور نہ اس بات کی کہ قرآن ان کے سامنے بار بار پیش کیا جائے۔یہ پیاسے تھے، اس وجہ سے جونہی ان کے سامنے پانی پیش کیا گیا وہ اس کی طرف دوڑ پڑے۔ان کی

آنکھیں طلبِ ہدایت کے لیے کھلی ہوئی تھیں، اور جن کی آنکھیں کھلی ہوں ان کو روشنی سے زیادہ عزیز کوئی شے نہیں ہوا کرتی۔ پس جس طرح آئینہ روشنی میں چمک جاتا ہے، یہ بھی روشنی پا کر چمک اٹھے۔ قرآن مجید نے سورۂ نور میں اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے کہ فطرت اور وحی، دونوں ایک ہی جنس کی چیزیں ہیں۔ یہ دونوں بندے کو ایک ہی سرچشمہ سے ملتی ہیں۔ صحیح فطرت کی مثال صاف و شفاف روغن کی ہے جو ہر طرح کی آمیزش اور ملاوٹ سے بالکل پاک ہے۔ اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ بغیر اس کے کہ اس کو آگ چھوئے، بھڑک اٹھنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ پس جونہی وحی والہام کی چنگاری اس سے مس ہوتی ہے فوراً بھڑک اٹھتا ہے:

يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيٓءُ وَلَوْ لَمْ	اس کا روغن اتنا شفاف ہو کہ گویا آگ
تَمْسَسْهُ نَارٌ ۚ نُورٌ عَلَىٰ نُورٍ ۗ	کے چھوئے بغیر ہی بھڑک اٹھے گا۔ روشنی
يَهْدِى اللّٰهُ لِنُورِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۚ	کے اوپر روشنی! اللہ اپنے نور کی ہدایت جس
(النور - ۲۴ : ۳۵)	کو چاہتا ہے بخشتا ہے۔

اوپر ہم نے جس آیت کا حوالہ دیا ہے اس میں محسنین اور متقین سے ایسے ہی لوگ مراد ہیں۔ احسان کے معنی ایک تو وہی ہیں جو عام طور پر سمجھے جاتے ہیں، دوسرا ایک اور مفہوم اس کا یہ ہے کہ اپنے قول و فعل کو پورے اخلاص و صداقت، پوری ہمت و عزیمت اور نہایت خوبی و کمال کے ساتھ انجام دینا۔ اہلِ لغت نے لفظ کی اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ احادیث میں بھی احسان کی یہ حقیقت بیان ہوئی ہے اور قرآن مجید نے اسی مفہوم کے اعتبار سے اہلِ مکہ یا اہلِ کتاب کی ان جماعتوں کے لیے اس کو استعمال فرمایا ہے جنھوں نے فطرت اور وحی کی روشنی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور بادِ مخالف کے جھونکوں سے اس کو گل ہونے نہیں دیا۔ ایسے لوگوں کی اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جگہ جگہ تعریف فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے، اللہ ان کے عمل کو ضائع نہیں کیا کرتا، قرآن مجید

ان کے لیے ہدایت و رحمت ہے، یہ اس کو سمجھتے ہیں اور اس کی تعلیمات سے فیض یاب ہوتے ہیں۔

باقی رہی دوسری جماعت جس نے اپنی فطری صلاحیتیں بالکل برباد کر ڈالی تھیں تو اس کے لیے قرآن مجید کی تعلیمات بالکل انوکھی تھیں، وہ کسی طرح بھی ان کو سمجھ نہیں سکتی تھی۔ یہ تعلیمات جن فطری اصولوں پر مبنی تھیں وہ تمام اصول ان کے اندر سے مٹ چکے تھے اور ان کی جگہ بالکل غیر فطری معتقدات و اوہام نے لے لی تھی۔ ان کی فطرت کا قالب اس درجہ ٹیڑھا ہو چکا تھا کہ کوئی سیدھی چیز اس میں سما ہی نہیں سکتی تھی۔ چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے قرآن مجید پیش کیا تو انہوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ اس کے سننے اور سمجھنے سے انکار کر دیا اور ان کا یہ انکار درحقیقت ان کے بہت سے سابق انکاروں کا لازمی نتیجہ تھا۔ انہوں نے ہدایت کے ابتدائی مراحل میں اس کو قبول کرنے سے اعراض کیا، اس لیے بعد کے مرحلوں میں بھی اس کا ساتھ نہ دے سکے۔ اور ایسا ہونا قدرتی تھا۔ ایک طالب علم درجہ بدرجہ ہی علم کی راہوں میں بڑھتا ہے۔ جس نے ایک فن کے ابتدائی قواعد خوب نہ سمجھ لیے ہوں اور ان کی پوری مشق نہ کر لی ہو، وہ ہرگز اس فن کے انتہائی مسائل نہیں سمجھ سکتا۔ چنانچہ یہی حال ان لوگوں کا ہوا۔ انہوں نے رشد و ہدایت کی ابجد ہی نہیں سیکھی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب ہدایت کا آخری صحیفہ نازل ہوا تو وہ اس کے سمجھنے سے بالکل ہی قاصر رہ گئے۔ قرآن مجید نے سورۂ اعراف میں اس معاملہ کی پوری تشریح کر دی ہے:

تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ	یہ بستیاں ہیں جن کی سرگزشتوں کا کچھ حصہ
اَنْۢبَآئِهَا ۚ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ	ہم تمہیں سنا رہے ہیں۔ ان کے پاس ہمارے
رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوْا	رسول کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے تو وہ ایمان
لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ	لانے والے نہ بنے بوجہ اس کے کہ وہ پہلے
قَبْلُ ۭ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰي	سے جھٹلاتے رہے تھے۔ اسی طرح اللہ

قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ٥ ٹھپہ لگا دیا کرتا ہے کافروں کے دلوں پر۔

(الاعراف ۔ ۷ : ۱۰۱)

یعنی ان لوگوں کا یہ تازہ انکار بہت سے سابق انکاروں کا ثمرہ ہے۔ سابق انبیاء نے ان کو جو سبق پڑھائے انہوں نے ان سب سے اعراض کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب یہ سبق بھی ان کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ یہی چیز ہے جس کو قرآن مجید اپنی اصطلاح میں 'ختم قلوب' کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی جو شخص خدا کی بخشی ہوئی ہدایت کو درجہ بدرجہ تمام مراحل میں قبول کرنے سے اعراض کرتا ہے بالآخر اس کا قلب سخت ہو جاتا ہے اور وہ اپنی فہم و بصیرت کی تمام استعدادیں کھو بیٹھتا ہے۔

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ خدا کی شریعت عمل کے لیے نازل ہوتی ہے اس لیے اس میں 'علم' اور 'عمل' یا 'جاننا' اور 'کرنا' دو چیزیں نہیں ہیں۔ اس میں جاننا بعینہٖ وہی چیز ہے جس کو 'کرنا' کہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص جانتا ہے اور اس پر عمل نہیں کرتا تو وہ جاننا یہاں معتبر نہیں، ایسا جاننا بے سود ہے، اس کی حقیقت اور جہل کی حقیقت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ علم بالکل بے نتیجہ ہے۔ اس علم سے مزید علم و عمل کے دروازے نہیں کھلا کرتے۔ ہم نے محض اپنی غلط فہمی یا کوتاہیٔ تعبیر کی وجہ سے جہل کا نام علم رکھ لیا ہے۔

یہود کے معاملہ میں بھی بالکل یہی صورتِ حالات پیش آئی۔ یہود کی اکثریت نے جس نے اپنے تمام انبیاء کی تعلیمات جھٹلا دی تھیں، قرآن مجید کا بھی انکار کر دیا، حالانکہ قرآن مجید سے سب سے زیادہ قریب وہی تھے۔ قرآن مجید ہدایت کا آخری زینہ ہے اور وہ اس زینہ سے صرف ایک ہی درجہ نیچے تھے۔ ان کا فرض تھا کہ وہ اس کو سب سے پہلے قبول کرتے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہو کر تمام دنیا میں اس کے حق ہونے کی گواہی دیتے۔ لیکن انہوں نے سب سے پہلے اس کا انکار کیا اور اس انکار کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ قرآن مجید سے پہلے جو ہدایتیں نازل ہوئی تھیں، وہ ان سب کا انکار کر چکے تھے اور سنتِ الٰہی کے لحاظ سے قرآن مجید کو قبول کرنے

کے لیے ضروری تھا کہ وہ پچھلی تمام ہدایتوں کو قبول کر چکے ہوں۔

اصولی طور پر یہ بات حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بالکل ابتدا ہی میں فرما دی گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو چند امتحانوں میں جانچا اور جب وہ ان میں پورے اترے تو فرمایا: اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا' (البقرۃ - ۲ : ۱۲۴) (بے شک میں تمہیں لوگوں کا پیشوا بناؤں گا)۔ انہوں نے سوال کیا: وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ ' (البقرۃ - ۲ : ۱۲۴) (اور میری اولاد میں سے یارب!)۔ جواب ملا: 'لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ ' (البقرۃ - ۲: ۱۲۴) (میرا یہ عہد ان لوگوں کو شامل نہیں ہے جو ظالم ہوں گے)۔ لیعنی میرا یہ عہد صرف ان سے متعلق ہے جو برابر میری ہدایت پر قائم رہیں، اس کو ہر مرحلہ میں قبول کریں، اور شرک و بت پرستی سے بچتے رہیں۔ یہی لوگ خدا کی ہدایت سے جلد سرفراز ہوں گے اور قوموں کی امامت پائیں گے۔

یہی بات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں دہرائی گئی۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے اپنی قوم کے لیے دعا فرمائی:

وَاکْتُبْ لَنَا فِیْ ھٰذِہِ الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ اِنَّا ھُدْنَآ اِلَیْکَ ط

(الاعراف - ۷ : ۱۵۶)

اور تو ہمارے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی لکھ دے اور آخرت میں بھی، ہم نے تو تیری طرف رجوع کیا۔

جواب میں ارشاد ہوا:

عَذَابِیْٓ اُصِیْبُ بِہٖ مَنْ اَشَآءُ وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ ط فَسَاَکْتُبُھَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ ط

(الاعراف - ۷ : ۱۵۶)

میں اپنے عذاب میں تو اسی کو مبتلا کرتا ہوں جس کو چاہتا ہوں اور میری رحمت ہر چیز کو عام ہے۔ سو میں اس کو ان لوگوں کے لیے لکھ رکھوں گا جو تقویٰ اختیار کریں گے۔

دتقویٰ اختیار کریں گے، یعنی وہ لوگ جو اس عہد پر، جو آج ان سے باندھا جا رہا ہے' قائم رہیں گے اور اس کی حرمت کو بٹہ نہیں لگائیں گے، وہی لوگ آئندہ خدا کی رحمت کے مستحق ہوں گے۔ یعنی جب خدا کی آخری شریعت، جو اس دنیا پر خدا کی آخری اور سب سے بڑی رحمت ہو گی، آئے گی تو وہ اس کو قبول کریں گے، اس کا انکار نہیں کریں گے۔ اور جو اس عہد پر قائم نہ رہیں گے وہ آئندہ نازل ہونے والی رحمت سے بھی محروم رہیں گے کیونکہ ان کے دل سخت ہو جائیں گے اور ان کے کفرانِ نعمت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر کر دے گا۔ چنانچہ جب قرآن مجید نازل ہوا اور اس کی وہ سورہ اتری جو سر تا سر یہود کو مخاطب کر رہی ہے، یعنی سورۂ بقرہ، تو اس کی دوسری آیت میں فرمایا کہ 'ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ' (یہ کتاب متقین کے لیے ہدایت بن کر نازل ہوئی ہے) یعنی اس کو صرف وہی لوگ قبول کریں گے جو متقی ہیں، جنہوں نے اپنے عہد و پیمان کو قائم رکھا ہے، جنہوں نے خدا کی نعمت کی قدر کی ہے۔ جنہوں نے ان تمام چیزوں کا انکار کر دیا ہے، وہ اس قرآن کا بھی انکار کر دیں گے، کیونکہ ان کے فسق و نافرمانی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْھِمْ	جن لوگوں نے کفر کیا، ان کے لیے یکساں
ءَاَنْذَرْتَھُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْھُمْ	ہے ڈراؤ یا نہ ڈراؤ، وہ ایمان لانے والے
لَا یُؤْمِنُوْنَ ○ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ	نہیں ہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان
وَعَلٰی سَمْعِھِمْ ط وَعَلٰٓی اَبْصَارِھِمْ	کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں
غِشَاوَۃٌ ز وَّلَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ○	پر پردہ ہے اور ان کے لیے عذابِ عظیم ہے۔

(البقرۃ - ۲: ۶-۷)

جو خدا سے عہد باندھ کر توڑ چکے ہیں، جو خدا کے قائم کیے ہوئے رشتہ پر مقراض چلا چکے ہیں، جو زمین میں خدا کے قانونِ حق و عدل کے دشمن ہیں، وہ ہرگز قرآن کی ہدایت نہیں قبول

کریں گے ۔ وہ تو اس سے بجائے ہدایت پانے کے اپنی گمراہی اور شرارت میں اور بڑھ
جائیں گے اور ان کی شقاوت و بدبختی پر آخری مہر لگ جائے گی ۔

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ
كَثِيْرًا ۭ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا
الْفٰسِقِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ
عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠
وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ
يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ
اُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝

اس کے ذریعہ سے اللہ بہتوں کو گمراہ کرتا
ہے اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے، اور
نہیں گمراہ کرتا ہے اس کے ذریعہ سے مگر ان
لوگوں کو جو نافرمان ہیں، جو اللہ کے عہد کو
پکا کرنے کے بعد توڑتے ہیں اور جس چیز کو
اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے۔ اس کو کاٹتے ہیں
وہی لوگ نامراد ہیں ۔

(البقرۃ - ۲ : ۲۶ - ۲۷)

اور ایسا ہی ہونا بھی چاہیے ۔ خدا کی ہدایت ایک نعمت ہے اور یہ نعمت اسی شخص
کو ملنی چاہیے جو اس کی قدر کرے اور اس سے فائدہ اٹھائے ۔ جو شخص نعمت کی ناقدری کرتا
ہے وہ ہرگز مزید نعمت پانے کا مستحق نہیں ہے ۔ ہدایت و ضلالت کے باب میں یہ
قانون ہمیشہ سے بالکل اٹل ہے ۔ جنہوں نے نعمتوں کو قبول کیا ان کے لیے نعمتیں بڑھتی گئیں
اور جنہوں نے ان کی ناقدری کی وہ ان سے محروم ہو گئے ۔ بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے
اپنے اس قانون سے پوری طرح آگاہ کر دیا تھا اور اسی کے مطابق ان کے ساتھ معاملہ کیا ۔

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَىِٕنْ
شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَىِٕنْ
كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۝
(ابراهیم - ۱۴ : ۷)

اور یاد کرو جب تمہارے رب نے آگاہ
کر دیا کہ اگر تم شکرگزار رہے تو میں تمہیں
بڑھاؤں گا اور اگر تم نے ناشکری کی تو
میرا عذاب بھی بڑا سخت ہوگا ۔

پس چونکہ بنی اسرائیل نے اللہ کی بخشی ہوئی نعمت کی قدر نہیں کی تھی اس وجہ سے

وہ قرآن کی نعمت سے بہرہ مند ہونے کے مستحق نہیں ٹھہرے، اور جیسا کہ فرمایا گیا تھا، جو ایک پیسہ میں چور ہے اس کو ایک لاکھ کی امانت نہیں سونپی جائے گی، وہ قرآن کی عظیم الشان امانت سے محروم رہے۔ ان کو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا۔ جب اس میں وہ راست باز اور امین نہیں ثابت ہوئے تو خدا ان کو اپنی پوری کتاب کیسے سونپ دیتا!

پس یہود کا بڑا حصہ، جو تورات وانجیل کی تعلیمات کو چھوڑ کر شہواتِ نفس اور رغباتِ دنیا کا شکار ہو چکا تھا، قرآن کے فیض سے بالکل محروم رہا۔ صرف ایک مختصر سی جماعت ان میں اہلِ حق کی باقی رہ گئی تھی۔ یہ لوگ قرآن مجید کی آمد کے منتظر تھے اور جونہی اس کی صدا ان کے کانوں میں پڑی انہوں نے اس کو قبول کر لیا۔ قرآن مجید نے جہاں جہاں یہود کی عام بدبختی کا ذکر کیا ہے وہاں اس چھوٹی سی جماعت کی حق پسندی کی تعریف بھی فرمائی ہے۔

ٹھیک ٹھیک یہی حال نصاریٰ کا ہوا۔ ان کی جماعت کے بڑے حصہ نے، جو اپنے اگلوں کی تقلید وپیروی میں گمراہ ہو کر دین کی اصلی تعلیمات سے محروم ہو چکا تھا، قرآن کو نہیں سمجھا۔ قرآن کی تعلیمات اس کو اپنے افکار وخیالات کے بالکل مخالف نظر آئیں۔ اس وجہ سے وہ ان کا دشمن بن گیا۔ البتہ وہ لوگ جن میں صحیح تعلیم کی روشنی موجود تھی اور جو حضرت مسیحؑ کے اشارات کی رہنمائی میں اس کے لیے منتظر تھے، انہوں نے جب قرآن کو پایا تو پورے جوش کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ قرآن مجید نے ان کے اس جوش کی تصویر ان لفظوں میں کھینچی ہے:

وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۝	اور جب یہ سنتے ہیں اس چیز کو، جو رسول کی طرف اتاری گئی ہے تو تم دیکھو گے کہ حق کو پہچان لینے کے سبب سے ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ وہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب!

وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ	ہم ایمان لائے تو ہمیں اس کی گواہی
وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ لا وَ	دینے والوں میں لکھ۔ اور آخر ہم اللہ پر
نَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا	اور اس حق پر جو ہم کو پہنچا ایمان کیوں نہ لائیں
مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ۝	جب کہ ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ ہمارا رب
(المائدۃ - ۵ : ۸۳ - ۸۴)	ہمیں نیکوکاروں کے زمرے میں شامل کرے گا۔

اس طرح کے تمام صالح العقیدہ نصاریٰ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے، انہوں نے اپنے عقائد و اعمال مسخ نہیں کیے تھے بلکہ ہوشیار اور مستعد طالب علم کی طرح جو کچھ ان کو پڑھایا گیا تھا اس کو پوری طرح محفوظ رکھا تھا اور اب مزید سبق کے لیے بیتاب تھے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو محسنین کے لقب سے ممتاز کیا:

فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا	تو اللہ ان کے اس قول کے صلے میں ان
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا	کو ہمیشہ رہنے کے لیے ایسے باغ عطا
الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ط وَ	فرمائے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی
ذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝	اور خوب کاروں کا یہی صلہ ہے۔
(المآئدۃ - ۵ : ۵۸)	

اس تفصیل کے بعد یہ بات واضح ہو گئی کہ قرآن مجید کے متعلق جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہ ہدایت ہے متقین کے لیے، یہ ہدایت ہے محسنین کے لیے، تو اس کا مفہوم اس سے کسی قدر وسیع ہے جو عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے، اس وجہ سے اس کا فہم و تدبر صرف ان ہی لوگوں کو نصیب ہوتا ہے جو اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہوں۔ اور اس کی شکر گزاری یہ ہے کہ یہ جس مقصد کے لیے ان کو دی گئی ہے، اس مقصد کو پورا کریں۔ اس کو دینے کا مقصد یہ ہے کہ اپنی عملی و اعتقادی زندگی پر اس کو پوری طرح

طاری کریں۔ جوں جوں وہ اس نعمت کے قدر و احترام میں بڑھتے جائیں گے اسی قدر اس کی برکتیں ان کے لیے بڑھتی جائیں گی۔

یہی وجہ ہے کہ پورا قرآن مجید ایک ساتھ نہیں نازل ہوا بلکہ تھوڑا تھوڑا کرکے نازل ہوا تاکہ امت کی قدر دانی اور شکر گزاری کا پورا پورا امتحان ہو جائے۔ جس طرح ایک طالب علم درجہ بدرجہ کسی فن کو حاصل کرتا ہے اسی طرح امت بھی بتدریج سبقاً سبقاً اس کو سیکھے اور اس کی تعلیمات کو پوری طرح اپنے اندر جذب کرلے۔ چنانچہ جو طریقہ قرآن مجید کے نزول کا تھا وہی طریقہ مسلمانوں نے اس کے سیکھنے اور سکھانے کے لیے اختیار کیا۔ اس کی ایک ایک آیت کو لیتے، اس پر فکر و تدبر کرتے، عملاً اس کی مشق و تمرین کرتے اور جب اس کو اپنے عمل و اعتقاد میں پوری طرح گھلا لیتے، تب آگے قدم بڑھاتے۔ علامہ سیوطی کی الاتقان میں ہے:

وقد قال ابو عبد الرحمان السلمی: حدثنا الذین کانوا یقرءون القران کعثمان بن عفان وعبد اللہ بن مسعود وغیرھما انھم کانوا اذا تعلموا من النبی صلی اللہ علیہ وسلم عشر آیات لم یتجاوزوھا حتی یعلموا ما فیھا من العلم والعمل. قالوا فتعلمنا القرآن والعلم والعمل جمیعاً ولھذا کانوا	ابو عبد الرحمان سلمی کہتے ہیں کہ مجھ سے ان لوگوں نے بیان کیا جو قرآن مجید پڑھتے پڑھاتے تھے مثلاً عثمان بن عفانؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ کہ ان لوگوں کا دستور یہ تھا کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دس آیتیں بھی پڑھ لیتے تھے تو جب تک ان آیات کے تمام علم و عمل کو اپنے اندر جذب نہ کر لیتے، آگے قدم نہ بڑھاتے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے قرآن کے علم و عمل دونوں کو ایک ساتھ حاصل کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایک ایک سورہ حفظ۔

يبقون مدة في حفظ[1] السورة[2]۔
یعنی فکر و مطالعہ میں وہ برسوں لگا دیتے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق روایتوں میں آتا ہے:

ان عبد الله بن عمر مكث على سورة البقرة ثماني سنين يتعلمها[3]۔
حضرت عبداللہ بن عمرؓ مسلسل آٹھ برس تک سورۂ بقرہ پر تدبر فرماتے رہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ صحابہؓ کا مطالعۂ قرآن ہمارے مطالعۂ قرآن سے بالکل مختلف تھا۔ وہ قرآن کو صرف علمی حیثیت سے جان لینے کے شائق نہ تھے، بلکہ ان کی اصلی طلب اس کی تعلیمات کی عملی مشق کے لیے تھی اور جب تک ایک آیت کو وہ اپنے علم و عمل کا جزو نہیں بنا لیتے تھے اس وقت تک وہ اس سے آگے نہیں قدم بڑھاتے تھے، اور یہی اس شکر کی اصلی حقیقت ہے جو نعمت کی زیادتی اور برکت کا باعث ہوتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے فہم و بصیرت کو اپنے انوار سے نورانی فرمایا اور صرف اسی ایک کتاب کے علم و عمل سے دونوں جہان کی تمام سربلندیاں ان کو بخش دیں۔

تدبّر قرآن کے داخلی اور خارجی وسائل:

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کا تعلق ارادہ اور نیّت کی درستی اور غایت و

---

[1] اس روایت میں 'حفظ' کا لفظ فکر و تدبر کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلف کی اصطلاح میں اس کا مفہوم اس سے بالکل مختلف ہے جو ہم اس لفظ سے سمجھتے ہیں۔

[2] الاتقان فی علوم القرآن: ج ۲، ص ۱۷۶

[3] مؤطا امام مالک: کتاب القرآن، باب ۴

مقصد کی پاکی اور طہارت سے تھا۔ جس طرح نماز کے لیے وضو اور نیت کا اخلاص و تزکیہ شرط ہے اسی طرح قرآن مجید کے فہم و تدبر کے لیے یہ شرط لازم ہے کہ طالب، دل کی سچی پاکی اور ارادہ کی پوری صداقت کے ساتھ اس کی طرف بڑھے، بغیر اس کے قرآن کا دروازہ نہیں کھل سکتا۔ یہ شرطیں خود قرآن مجید نے بیان کی ہیں اور صدیوں کا تجربہ اس حقیقت کی تصدیق کر رہا ہے۔

اس کے بعد قرآن مجید کے فہم و تدبر کے طریقہ اور اس کے داخلی اور خارجی اسباب و وسائل کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ یعنی ایک تو یہ بات کہ قرآن مجید کو کس طرح پڑھنا چاہیے، کتنی مقدار میں پڑھنا چاہیے، کیا کیا ترتیبیں پیشِ نظر رکھنی چاہئیں، نظم کو کس طرح پکڑنا چاہیے، معانی کو کس طرح سلجھانا چاہیے، مشکلات میں کس طرح جمنا چاہیے، سمٹے ہوئے خیالات کو کس طرح پھیلانا چاہیے اور پھیلے ہوئے خیالات کو کس طرح سمیٹنا چاہیے۔ یعنی مختصر الفاظ میں یہ بات کہ قرآن کی مشکلات میں خود قرآن مجید کی رہنمائی سے کس طرح فائدہ اٹھانا چاہیے اور دوسری یہ بات کہ قرآن مجید سے باہر کیا کیا چیزیں ہیں جو قرآن کے فہم و تدبر میں ہماری مدد کر سکتی ہیں اور ان سے کن کن مشکلوں میں فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے؟

ان تمام سوالات پر یہاں تفصیل سے بحث کرنے کا موقع نہیں ہے، ہمارے دوسرے مضمون میں ان شاء اللہ ان سوالات پر بقدرِ ضرورت گفتگو ہو گی۔ یہاں صرف پہلے سوال کے ایک حصہ اور دوسرے سوال کے بعض ضروری پہلوؤں کی طرف بالاجمال اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

قرآن کی تفسیر خود قرآن سے:

قرآن مجید کے فہم و تدبر کے لیے اصلی چیز خود قرآن مجید ہی ہے۔ اس لیے قرآن کے طالب کو چاہیے کہ وہ تمام مشکلات میں پہلے قرآن مجید ہی کی رہنمائی ڈھونڈے۔ سلف کا مذہب

بالاتفاق یہ رہا ہے کہ اُلقران یفسّر بعضہ بعضاً (قرآن کا ایک حصّہ اس کے دوسرے حصّہ کی خود تفسیر کرتا ہے) اور قرآن نے خود اپنی صفت کِتَاباً مُّتَشَابِھاً بیان کی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا ہر حصّہ دوسرے حصّہ سے ملتا جلتا ہے۔ نیز بعض مواقع پر اس امر کی بھی تشریح ہے کہ جس طرح قرآن کا نزول اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اسی طرح اس کے اجمالات کی تفصیل کرنے کی ذمہ داری بھی اسی پر ہے۔ اصولی حیثیت سے یہ بات اگرچہ ہر دور میں اربابِ تاویل کے پیش نظر رہی ہے، لیکن اس معاملہ کی صحیح نوعیت تفصیل و وضاحت کے ساتھ لوگوں کے سامنے کبھی نہیں آئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عموماً اربابِ تفسیر کو یہ راہ نہایت دشوار نظر آئی اور وہ بعض ایسی وادیوں میں نکل گئے جو فہمِ قرآن سے نہایت دور کرنے والی تھیں، حالانکہ فہمِ قرآن کی کلید خود قرآن ہی ہے۔ وہ اپنے تمام اجمالات کی خود تشریح کرتا ہے۔ وہ اپنے مفہوم و معنی کی تعیین، اپنے مقاصد و مطالب کی تفسیر اور اپنے نکات و حقائق کی تشریح کے لیے کسی چیز کا محتاج نہیں ہے۔ بلکہ قرآنی بلاغت کا یہ ایک عجیب اعجاز ہے ——— اور یقیناً اس آسمان کے نیچے صرف اسی کتاب عزیز کی یہ خصوصیت ہے ——— کہ وہ اپنے اکثر مشکل الفاظ اور دقیق اسالیب کے حل کے لیے بھی اپنے اندر مثالوں اور نظائر کا ایک قیمتی ذخیرہ رکھتی ہے۔ افسوس ہے کہ یہاں تفصیل میں پڑنے کی گنجائش نہیں ہے، ورنہ ہم دکھاتے کہ کس طرح قرآن مجید عام بول چال کے اندر سے ایک معمولی لفظ اٹھا لیتا ہے اور اس کو اس کے معروف استعمال سے کہیں زیادہ بلند معنی میں استعمال کرتا ہے اور پھر اپنے طریقِ استعمال کے تنوّع سے اس کے لیے ایک ایسا مخصوص ماحول پیدا کر دیتا ہے کہ لسان العرب اور صحاح جوہری کی رہنمائی کے بغیر قرآن کا ایک طالب اس لفظ کے پورے مالہٗ وما علیہ کو اس طرح سمجھ لیتا ہے کہ کوئی چیز بھی اس کے یقین کو جھٹلا نہیں سکتی۔

مفرد الفاظ کے علاوہ اسالیبِ کلام اور نحوی تالیف کے باب میں بھی قرآن مجید کا یہی حال ہے۔ اربابِ نحو قرآن مجید کی جن ترکیبوں میں نہایت الجھے ہیں اور کسی طرح ان کو نہیں سلجھا سکے ہیں خود قرآن مجید میں ان کی مثالیں ڈھونڈ۔ یے تو ایک سے زیادہ مل جائیں گی اور پیش و عقب کے ایسے دلائل و قرائن کے ساتھ مل جائیں گی کہ ان کے بارہ میں ہمارے اطمینان کو کوئی چیز مجروح نہیں کر سکتی۔

باقی رہی قرآن مجید کی تعلیمات، اس کے تاریخی اشارات، اس کی مخفی تلمیحات تو یہ تو ایسی چیزیں ہیں جن کے باب میں ہر گروہ نے 'القرآن یفسر بعضہ بعضاً' کے اصول کو تسلیم کیا ہے۔ اس باب میں لوگوں سے جو کوتاہی ہوئی ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ پوری دیدہ ریزی سے کام نہیں لیا گیا، جتنا اگلوں نے کر دیا لوگ اسی پر قانع ہو گئے۔ حالانکہ اس میں بہت وسعت ہے۔ اور قرآن مجید کے شواہد اس قدر مختلف شکلوں میں اور اس قدر کثرت کے ساتھ موجود ہیں کہ ہر بات کو واضح کر دینے کے لیے بالکل کافی ہیں۔ پس جو لوگ قرآن مجید پر تدبر کرنا چاہیں ان کو چاہیے کہ وہ قرآن مجید ہی کو مضبوط پکڑیں اور اس کی ہر مشکل کو خود اسی کی مدد سے حل کرنے کی کوشش کریں۔

تفسیروں کی نوعیت:

ہمارے نزدیک یہ طریقہ صحیح نہیں ہے کہ قرآن مجید کے مطالعہ میں تفسیروں کو مقدم رکھا جائے۔ اس راہ میں طرح طرح کے خطرے ہیں۔ ہم تفسیروں کی حالت پر آگے بحث کریں گے۔ ہمارے پاس جو تفسیریں ہیں وہ دو ہی قسم کی ہیں، یا تو وہ کسی خاص مسلک کی ترجمانی کر رہی ہیں یا وہ روایات اور اقوالِ سلف کے تمام رطب و یابس کا مجموعہ ہیں۔ ایک حقیقی طالب کی راہ میں یہ دونوں چیزیں روک ہو سکتی ہیں۔

طالبِ قرآن جب ان کے چکر میں پھنس جاتا ہے تو اس کی جستجو اور تحقیق کی رو طبعی نہیں رہ جاتی، مصنوعی اور غیر طبعی ہو جاتی ہے۔ وہ اس راہ پر پڑ جانے کے بعد قرآن کے لفظوں کی رہنمائی سے محروم اور اس کا مذاق آہستہ آہستہ دوسروں کے خیالات و افکار سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ پس صحیح راہ یہی ہے کہ آدمی ان چیزوں میں سے کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائے، صرف قرآن کو اپنی تمام توجہ کا مرکز بنائے۔ اس کی ایک ایک آیت بلکہ ایک ایک لفظ پر تدبر کرے، ٹھیک مفہوم متعین کرے، طبیعت میں جو سوال پیدا ہو اس پر بار بار غور کرے، جو بات سمجھ میں آئے اس کے نظائر و شواہد تلاش کرے، سیاق و سباق سے اس کی مطابقت معلوم کرے، نظم کے اعتبار سے اس کا موقع و محل دیکھے، عمودِ کلام کے پہلو سے اس کی مناسبت کو جانچے، پھر اس پر خود اپنی طرف سے شکوک و شبہات وارد کرے اور جب دیکھ لے کہ اس نے جو بات سمجھی ہے بالکل پکی ہے، اس میں کسی پہلو سے کوئی خامی نہیں ہے، تب تفسیروں میں اس کو دیکھے اور ہمیشہ صحیح روایات پر نگاہ رکھے۔ ضعیف اور کمزور روایات کو، جن سے کتبِ تفسیر بھری ہوئی ہیں، کبھی ہاتھ نہ لگائے۔ ان شاءاللہ صحیح روایات سے اس کی تائید ہوگی اور اپنے دل میں ایک ایسی خوشی کا جوش محسوس کرے گا جس میں اطمینان، بلندی، اعتماد اور عشق و محبتِ قرآن کی نہیں معلوم کتنی کیفیتیں ملی ہوئی ہوں گی۔

لیکن فرض کیجیے یہ سارے جتن کرنے کے بعد آپ کسی آیت کے باب میں ایک نتیجہ تک پہنچے اور جب تفسیروں کی کتابوں کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ صحیح حدیثیں اور سلف کے اقوال آپ کے اختیار کردہ مطلب کے خلاف ہیں اور کوئی ادنیٰ تائید بھی آپ کے ساتھ نہیں ہے تو اس وقت کیا کریں گے؟ کیا روایات اور اقوالِ سلف کو چھوڑ کر اپنی بات پر جم جائیں گے؟ نہیں! طالبِ صادق کی راہ یہ نہیں

ہے، بلکہ آپ ان احادیث اور اقوال کی روشنی میں اپنی تاویل پر دوبارہ غور کریں گے۔

اس صورت میں گمانِ غالب تو یہی ہے کہ اگر آپ غلطی پر ہوں گے تو آپ کی غلطی خود واضح ہو جائے گی۔ لیکن فرض کیجیے آپ نے یہ مرحلہ بھی طے کر لیا مگر آپ کو اپنی ہی تاویل صحیح معلوم ہوتی ہے، اب کیا کریں گے؟ اب خود حدیث پر غور کریں گے۔ اس کو ہر پہلو سے پرکھیں گے، ہر کسوٹی پر جانچیں گے، ان شاء اللہ یہ چیز مفید ثابت ہوگی۔ یا تو آپ کی تاویل کا ضعف واضح ہو جائے گا، یا حدیث کی اصل حقیقت واضح ہو جائے گی، لیکن طالب کے لیے یہ مرحلے نہایت سخت ہیں۔ ان میں صبر و ثبات کی ضرورت ہوتی ہے۔ عجلت اور تیز گامی اس منزل میں معصیت ہے۔ اس طرح کے مواقع پر عرصہ تک توقف کرنا چاہیے اور پھر سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہیے۔ جب قلب پوری طرح سے ایک بات کے لیے کھل جائے، کسی طرح کی بھی کوئی خلش باقی نہ رہ جائے تو اس بات کو اختیار کر لینا چاہیے اور پھر اس امر کی ذرا بھی پروا نہیں کرنی چاہیے کہ کوئی چیز اس کے خلاف ہے۔

اس طریقۂ فکر و نظر کا ایک خاص فائدہ یہ ہے کہ اس سے آدمی کو جو کچھ ملتا ہے یہ اس کی اپنی تحقیق و کاوش کا ثمرہ ہوتا ہے اور آدمی کی یہ ایک نفسیاتی خصوصیت ہے کہ وہ اپنی کمائی کو بہت عزیز رکھتا ہے۔ اس کی محبت اس کے ریشہ ریشہ میں پیوست ہو جاتی ہے اور اس کی حفاظت کی راہ میں وہ کسی چیز سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ گویا اصلی کیفیت جو قرآن کی اصلی منزلِ مقصود ہے، اسی طریقۂ فکر و نظر سے ملتی ہے۔ پھر اس سے طالب کے زاویۂ نگاہ میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے، وہ ٹھوکریں کھا کر اور سختیاں جھیل کر فکر و تدبر کے میدان کا آزمودہ کار سپاہی بن جاتا ہے اور تحقیق و کاوش کے مورچوں میں کبھی بددل اور پست ہمت نہیں ہوتا۔ وہ گھسنے کی تمام راہوں اور نکلنے کے تمام راستوں کا ماہر ہو جاتا ہے، اس کی ایک راہ بند کر دو،

دوسری راہ کھول لے گا، اگر ایک دروازہ نہیں کھلے گا، دوسرے دروازہ پر دستک دے گا، اس طرح درجہ بدرجہ وہ اپنی منزلیں طے کرتا ہوا اُس مقام تک پہنچ جائے گا جو حکمت اور معارفِ نبوت کی اصلی جلوہ گاہ ہے۔ یہاں پہنچ کر اس کی معلومات دوسروں کی معلومات سے بالکل مختلف ہوں گی۔ دوسرے جس چیز کو معبود بنا کر پوج رہے ہوں گے وہ اس کو بالِ مگس کے برابر بھی وقعت نہ دے گا اور دوسرے جس شے کو حقیر سمجھ کر ٹھکرا دیں گے وہ اس کو حرزِ جاں بنا کر گرہ کرے گا۔ یہ اس لیے کہ دوسروں کے پاس کوئی تجربہ نہیں ہے لیکن اس کے پاس بے شمار تجربات کی رہنمائی ہے۔ وہ اس سمندر کے عجائب سے واقف ہے، دوسرے اس منزل کی رسم و راہ سے واقف نہیں ہیں۔

عرب جاہلیت کی تاریخ:

قرآن مجید کے تدبر میں عہدِ نزولِ قرآن اور قدیم عرب اور ان سے متعلق اقوام کی تاریخ سے واقفیت بھی ایک ضروری عنصر ہے۔ قرآن کی بے شمار آیتیں عرب کی قدیم تاریخ اور اس سے متعلق اقوام اور جماعتوں کے احوال و ایام کی طرف اشارے کرتی ہیں اور یہ اشارات بالعموم اس قدر مجمل و مبہم ہیں کہ ان کا صحیح تصور ذہن میں قائم ہونا اس وقت تک مشکل ہو جاتا ہے جب تک ان قوموں کی تاریخ سے واقفیت نہ ہو۔ بلاشبہ جہاں تک قرآن مجید کی تعلیمات کے سمجھ لینے کا تعلق ہے یہ ابہام و اجمال مانع نہیں ہوتا ہے، لیکن ان اشارات کے صحیح تصور سے کلام کی تاثیر میں ایسا اہم اضافہ ہو جاتا ہے کہ اس سے اغماض نہیں برتا جا سکتا، بلکہ ہو سکتا ہے کہ قرآن کی جن سورتوں کو سن کر عہدِ نزولِ قرآن میں ایک عرب بے خود ہو جاتا ہو ہمارے لیے وہ محض اس وجہ سے بالکل بے اثر ہو کر رہ جائیں کہ ان کے اندر جو اشارات ہیں ہم ان کے صحیح

تصور سے محروم ہیں۔

پھر قرآن مجید کے نزول پر پوری چودہ صدیاں گزر چکی ہیں اور ہم کو اسے موجودہ دنیا کے سامنے پیش کرنا ہے۔ قرآن کے عہدِ نزول میں جو واقعات و احوال ہر شخص کے جانے بوجھے ہوئے تھے موجودہ دنیا کے لیے لامعلوم ہیں اور علم و تحقیق کی ترقیوں نے آج کسی امر کے ردّ و قبول کا معیار اس قدر بلند کر دیا ہے کہ جب تک اس عہد کی پوری دنیا اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ لوگوں کے سامنے نہ رکھ دی جائے لوگ اس کو کوئی وزن ہی نہیں دیں گے۔

علاوہ ازیں اس عہد کی تاریخ کی بے شمار چیزیں ہم کو اس لیے بھی معلوم ہونی چاہئیں کہ ان کے جانے بغیر قرآن مجید کی تعلیمات کا اصلی وزن نہیں معلوم ہو سکتا، مثلاً اُس عہد کی تمدنی حالت، اُس عہد کے سیاسی رجحانات، اس زمانہ کے مذہبی عقائد و تصورات اور اخلاقی معیارات وغیرہ، نیز زمانۂ نزولِ قرآن میں مختلف قوموں کے باہمی تعلقات کی نوعیت، اُن کے دستور و مراسم کی کیفیات، ان کے اصنام کی خصوصیات اور تمدن و سیاست پر ان کے اثرات وغیرہ۔

قرآن مجید پر غور کرنے والوں کو، اگر ان کا فکر و نظر صحیح نہج پر ہے، ان امور کے متعلق طرح طرح کے شبہے پیدا ہوتے ہیں اور یہ نہایت بدقسمتی کی بات ہے کہ ایک تفسیر بھی ایسی نہیں ہے جو ان چیزوں کے متعلق ہماری کوئی رہنمائی کر سکے۔ عرب کی تاریخ سے متعلق ہمارے پاس جو معلومات ہیں وہ نہایت مسخ شدہ ہیں قرآن کے تدبر میں ان سے کوئی مدد ملنا تو درکنار الٹے ان سے طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس وجہ سے اس معاملہ میں بھی صحیح مسلک یہی ہے کہ اصلی معتمد قرآن مجید ہی کو بنایا جائے اور تاریخوں کی پیش کردہ معلومات پر قرآن کی روشنی میں غور کر کے ان کے صرف اتنے ہی حصہ کو اختیار کیا جائے جتنا قرآن مجید سے موافق

پڑتا ہے۔ اس معاملہ میں استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے طریق فکر و نظر کا اندازہ کرنے کے لیے سورۂ فیل کی تفسیر پڑھنی چاہیے، اس سے معلوم ہوگا کہ ان کا اصلی اعتماد قرآن مجید کے اشارات اور کلامِ عرب پر ہوتا ہے اور تاریخ کی روایات کو وہ ہمیشہ انہی دونوں کسوٹیوں پر رکھ کر قبول کرتے ہیں اور حق یہ ہے کہ اس باب میں ان دو چیزوں کے سوا کسی تیسری چیز سے مشکل ہی سے مدد ملتی ہے۔

کلامِ عرب، نحو اور فنِ بلاغت :

قرآن مجید کی زبان اور اس کے اسالیب کی مشکلات حل کرنے میں تین طرح کی چیزیں مدد دے سکتی ہیں :

۱۔ کتبِ لغت اور کلامِ عرب ؛
۲۔ کتبِ نحو ؛ اور
۳۔ کتبِ بلاغت ۔

لغت کی کتابوں میں لسان العرب سب سے زیادہ مدد دے سکتا ہے یہ سب سے زیادہ جامع لغت ہے۔ اہلِ لغت کا تمام قیل و قال اس میں یکجا مل جاتا ہے۔ لیکن قرآن مجید کے الفاظ کے بارہ میں عموماً اس کا طریقہ یہ ہے کہ اربابِ تاویل کے اقوال نقل کر دیتا ہے۔ یہ چیز نہایت غلط ہے۔ اس سے بچنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ لغت دیکھنے کا اصلی فائدہ ہی فوت ہو جاتا ہے۔

بعض لوگ مفردات امام راغب کو بھی پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے تو یہ قابلِ قدر ہے کہ خالص قرآن کا لغت ہے۔ لیکن حلِ مشکلات کے پہلو سے اس کا کوئی وزن نہیں ہے۔ صرف مبتدیوں کو اس سے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اس کا طریقہ

اگرچہ صحیح ہے، لیکن نہ تو اس میں سارے الفاظ ہی ملتے ہیں نہ کلامِ عرب سے اس میں شہادتیں ہی پیش کی گئی ہیں، اس وجہ سے یہ کچھ زیادہ مفید چیز نہیں ہے۔

اصلی چیزیں جن کی ایک طالبِ قرآن کو ضرورت پڑتی ہے، یہ ہیں کہ ایک لفظ کے صحیح حدود و اطراف کیا ہیں، یہ خالص عربی ہے یا مولّد، پھر اس کے اصلی معنی کیا ہیں اور اس کے معنی میں سے کن پر اس کا اطلاق حقیقتاً ہے اور کن پر بطریقِ مجاز۔ لیکن یہ باتیں لغتوں سے مشکل ہی سے معلوم ہو سکتی ہیں۔ اس پہلو سے کوئی لغت بھی کارآمد نہیں ہے، کہیں کہیں صحاحِ جوہری میں بعض چیزوں کی جھلک نظر آجاتی ہے، مگر بہت کم۔

قابلِ اعتماد چیز اس باب میں دراصل کلامِ عرب ہی ہے۔ لفظ کے اصلی حقائق اسی سے کھلتے ہیں۔ پھر اسالیب کلام کا معاملہ تو سر تا سر اسی سے متعلق ہے، لغت سے اسالیب کلام کے بارہ میں کوئی رہبری نہیں ہوتی۔ لیکن کلامِ عرب میں بھی اصلی اور نقلی دونوں ہیں۔ آدمی کو ایک عرصہ کی مشق کے بعد —— اگر ذوق اچھا ہو —— اصلی و نقلی کے مابین امتیاز ہوتا ہے اور یہ امتیاز نہایت ضروری ہے، ورنہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آدمی بالکل شاذ اور غیر معروف معنی کو اختیار کر لیتا ہے اور معروف معنی کو چھوڑ دیتا ہے، مثلاً بعض لوگوں نے صرف اصلی اور نقلی میں امتیاز نہ کر سکنے ہی کی وجہ سے "تَمَنّٰی" کے معنی تلاوت کرنے کے یا "نحر" کے معنی سینہ پر ہاتھ باندھنے کے لے لیے۔ اس کی مثال تفسیروں میں بہت ملتی ہے۔

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ کا تمام تر اعتماد کلامِ عرب پر تھا۔ وہ جس لفظ یا جس اسلوب کے بارہ میں متردد ہوتے اس کو صرف قرآن مجید اور کلامِ عرب میں ڈھونڈتے بعض الفاظ و اسالیب کی تلاش میں انہوں نے مدتیں صرف کر دیں۔ ان کی کتب، اسالیب القرآن اور مفردات القرآن میں اس سلسلہ کے تمام معرکے

ملیں گے۔ "غُثَآءً اَحْوٰی" میں لفظ "غثاء" کے بارہ میں مولانا خود فرماتے تھے کہ میں نے اس کے صحیح مفہوم کی تحقیق میں برسوں صرف کر دیے۔ اس لفظ کے بارہ میں ان کو تمام اہلِ لغت اور اربابِ تفسیر سے اختلاف تھا چنانچہ ایک مدت تک وہ اس کی تحقیق میں کلامِ عرب کا ذخیرہ چھانتے رہے اور فرماتے تھے کہ جس روز میری تحقیق مکمل ہوئی ہے مجھے وہ خوشی حاصل ہوئی ہے جو بادشاہوں کو ملکوں کی تسخیر میں بھی نہیں ہوتی ہو گی۔

کتبِ نحو کا معاملہ کتبِ لغت سے بھی زیادہ مایوس کن ہے۔ یہ لوگ قرآن کی نحوی مشکلات کو بالعموم عام ضابطہ سے الگ شواذ کے سلسلہ میں ذکر کرتے ہیں، حالانکہ قرآن عرب کے سب سے زیادہ معروف اسلوب پر اترا ہے۔ اربابِ تفسیر میں سے زمخشریؒ کے سوا کسی نے قرآن کی نحوی مشکلات سے زیادہ بحث نہیں کی ہے اور یہ کام تنہا ایک شخص کے بس کا نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ تفسیر کی کتابوں میں قرآن مجید کی نحوی مشکلات حل کرنے کے لیے ہم کوئی قیمتی رہنمائی نہیں رکھتے اور چونکہ اپنے اندر مزید کشف و تحقیق کی ہمت نہیں پاتے، اس لیے مجبور ہیں کہ اربابِ نحو نے جو اصول بیان کر دیے ہیں انہی پر اعتماد کریں اور کسی نہ کسی طرح قرآن مجید کو انہی کے مطابق ثابت کر دکھائیں۔ حالانکہ اس کی وجہ سے تاویل کی بے شمار لاینحل مشکلات پیدا ہو گئی ہیں۔ قرآن کے طلبہ کو چاہیے کہ نحوی مشکلات میں کلامِ عرب پر اعتماد کریں تاکہ ایک طرف صحیح تاویل کی راہ کھلے اور دوسری طرف دنیا پر یہ حقیقت روشن ہو جائے کہ درحقیقت قرآن ہی کا اسلوب اعلیٰ اور معروف اسلوب ہے۔ استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ کے مطبوعہ رسائل میں ان کے طریقِ تحقیق کی بہت سی مثالیں موجود ہیں اور آئندہ ان کی دوسری تصنیفات میں بھی جو شائع ہوں گی، ان کی کاوشیں ملیں گی۔ ان کی رہنمائی سے اس سلسلہ میں بہت کچھ خدمت انجام دی جا سکتی ہے۔

فنِ بلاغت کی نارسائیوں کا حال سب سے زیادہ یاس انگیز ہے۔ ہمارے اربابِ بلاغت کا تمام تر ماخذ شعراء کا کلام ہے اور شعر کی تنگ دامانیوں کا حال معلوم ہے کہ وہ بلاغتِ کلام کی نہایت ابتدائی اور سطحی باتوں ہی کے لیے ماخذ کا کام دے سکتا ہے۔ اس لیے ان کی تمام جولانیاں دروبست کی نزاکتوں، الفاظ کے حسن و قبح اور بدیع کی گل کاریوں تک محدود ہیں۔ رہیں یہ باتیں کہ حسنِ استدلال کے کیا کیا پہلو ہیں، ربطِ معنی کی کیا کیا ادائیں ہیں، مثال و قصص سے عبرت پذیری کے کیا کیا ڈھنگ ہیں، کلام کس کس طرح چلتا ہے، کس کس طرح اپنے مرکز اور عمود کی طرف مڑتا ہے، تہدید و زجر کے کیا کیا اسلوب ہیں، متکلم اپنی شدتِ یقین کو کس طرح ظاہر کرتا ہے، شریفانہ اعراض کے کیا کیا ڈھب اختیار کرتا ہے، ایک شفیق معلم کن کن شکلوں میں حسرت کرتا ہے، عتاب میں محبت کی جاں نوازیاں کس طرح ہوتی ہیں، خطاب کے عجائبِ تصرفات کا کیا عالم ہے؛ ان تمام مباحث سے ہمارا تمام دفترِ بلاغت بالکل خالی ہے۔ یہ چیزیں یا تو خطبائے عرب کے کلام میں مل سکتی تھیں یا قرآن مجید میں مل سکتی ہیں۔ خطباء کا کلام لوگوں کو ملا نہیں اور قرآن کو لوگوں نے ماخذ نہیں بنایا۔ اس سلسلہ میں باقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی کوشش قابلِ قدر ہے، لیکن وہ بھی مجبور ہوئے کہ اصول کے استنباط کے لیے شعروں ہی کو ماخذ قرار دیں۔ خطباء کے کلام کی طرف اول تو وہ پوری طرح متوجہ نہیں ہوئے اور ہوئے بھی تو محض اس قدر کہ ان کے کچھ سرسری نمونے پیش کر کے گزر گئے۔ ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ کی تصنیفات میں بہت سے جواہر ریزے ملتے ہیں، لیکن کاوش اور تلاش کی ضرورت ہے۔ استاذ امام کی جمہرۃ البلاغۃ اس سلسلہ کی آخری اور سب سے زیادہ اہم چیز ہے، انہوں نے اس فن کی ترتیب ہی بدل دی ہے اور نئے اصول دریافت کیے ہیں جو بلاغتِ قرآن کے جانچنے کے لیے صحیح معیار قرار پا سکتے ہیں۔

قرآن اور کتابِ مقدّس :

قرآن کے طالب علم کو کتبِ سابقہ پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔ جہاں تک احکامِ شریعت اور حقائقِ دین کے ماننے کا تعلق ہے، ہم کتبِ سابقہ کے محتاج نہیں ہیں، آفتاب کی تابانی کے بعد ستاروں کی رہنمائی کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے قرآن کے بعد ان تحریف شدہ کتابوں سے اعراض کیا، لیکن بعض ضروری چیزیں ایسی ہیں جن کے لیے کتبِ سابقہ کا مطالعہ نہایت مفید ہے۔

یہ معلوم ہے کہ قرآن آسمانی کتابوں میں سے ایک ہے اور ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سلسلۂ انبیاء کی آخری کڑی ہیں۔ پس سابقہ کتابوں کے مطالعہ سے ہم کو طرح طرح کے فائدے ہوں گے۔ اس سے ہم پر قرآن مجید کی حقیقی عظمت آشکارا ہوگی، قرآن کی بہت سی تلمیحات بے نقاب ہوں گی، اہلِ کتاب کو قائل کرنے کے دلائل ہاتھ آئیں گے۔ یہ آخری چیز اس زمانہ میں نہایت اہم ہوگئی ہے۔ اہلِ کتاب کو قرآن کے بعض حوالوں پر طرح طرح کے اعتراضات ہیں اور اُن کا مُسکت جواب اسی وقت ممکن ہے جب تورات وانجیل اور ان سے متعلق تمام لٹریچر پر آدمی کی نظر ناقدانہ ہو۔

قرآن مجید کی ان تلمیحات واشارات کا معاملہ بھی نہایت اہم ہے جو اہل کتاب سے متعلق ہیں۔ قرآن مجید پر ابتدائی ایمان لانے والے یا تو اہلِ کتاب تھے جو اپنے گھر کی باتوں سے اچھی طرح واقف تھے یا مسلمان تھے جو اہلِ کتاب سے میل جول رکھنے کی وجہ سے ان کے خیالات وعقائد اور ان کی روایات سے باخبر تھے۔ اس وجہ سے قرآن مجید نے اہلِ کتاب کے عقائد، ان کے مزعومات، ان کی تحریفات اور ان کے تاریخی واقعات وغیرہ کی طرف اس قدر اجمالی اشارات کیے ہیں کہ ان کا صحیح تصوّر قائم کرنا بہت مشکل ہوتا ہے اور آج اسی صورت میں ممکن ہے جب اہلِ کتاب کے صحیفوں اور ان

کے مذہبی لٹریچر پر پوری نظر ہو۔

پھر قرآن مجید نے بعض مقامات میں ان کی کتابوں کا اس طرح حوالہ دیا ہے جس سے مترشح ہوتا ہے کہ قرآن مجید یہ چاہتا ہے کہ ان کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔ مثلاً فرمایا ہے:

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ	اور ہم نے زبور میں موعظت کے بعد
بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ	لکھ دیا ہے کہ زمین کے وارث میرے نیک
يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ٥	بندے ہی ہوں گے۔

(الانبیآء - ۲۱ : ۱۰۵)

دوسری جگہ فرمایا ہے:

إِنَّ هَٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ	یہی تعلیم اگلے صحیفوں میں بھی ہے، موسیٰ
صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ ٥	اور ابراہیم کے صحیفوں میں۔

(الاعلیٰ - ۸۷ : ۱۸ - ۱۹)

تاریخی احوال و واقعات کی طرف اشارہ کرنے کا یہ اسلوب ہے:

وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ	اور ہم نے بنی اسرائیل کو اپنے اس فیصلہ
فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ	سے کتاب میں آگاہ کر دیا تھا کہ تم دو
مَرَّتَيْنِ۔	مرتبہ زمین میں فساد مچاؤ گے۔

(بنی اسرآءیل - ۱۷ : ۴)

غرض کتبِ سابقہ کا مطالعہ اگر پوری تحقیق و تنقید سے کیا جائے تو قرآن مجید کا طالب علم اس سے طرح طرح کے فائدے حاصل کر سکتا ہے۔

لیکن ان کتابوں کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے کسوٹی قرآن مجید ہی کو قرار دیا ہے۔ جہاں ان کتابوں میں اور قرآن میں اختلاف ہوگا وہاں ہم قرآن کو اختیار کریں گے اور

ان کتابوں کو چھوڑ دیں گے۔ استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ ان کتابوں سے جس طرح فائدہ اٹھاتے ہیں اور پھر جس طرح ان کی غلطیاں اور قرآن مجید کی حقانیت واضح کرتے ہیں اس کی مثالیں یوں تو ان کی تمام تصنیفات میں مل سکتی ہیں، لیکن بالخصوص رسالہ ذبیح میں ان کا زور دیکھنا چاہیے۔ سلف میں سے علامہ ابن تیمیہؒ کی واقفیت اہل کتاب کے متعلق براہِ راست معلوم ہوتی ہے۔

یہ چند ضروری چیزیں جو طلبۂ قرآن کے لیے نافع ہیں ہم نے بیان کر دی ہیں مگر یہ خارجی وسائل و ذرائع جو بیان ہوئے ہیں، یہ سب ثانوی چیزیں ہیں، اصلی چیزیں وہی ہیں جو مضمون کی ابتدا میں بیان کی گئی ہیں۔ ان کے بغیر آدمی کے لیے یہ تمام وسائل و ذرائع یک قلم بے کار ہیں۔ ہاں اگر ان تمام امور کے ساتھ ان چیزوں کا بھی پورا اہتمام ہو تو ہم کو یقین ہے کہ طالب کی راہ بہت آسان ہو جائے گی اور یہ زیادہ سے زیادہ کامیابی ہے جو اس راہ میں حاصل کی جا سکتی ہے۔ ان وادیوں کے قطع کر لینے کے بعد بھی کسی شخص کو یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ وہ پورا قرآن سمجھ لے گا اس معاملہ کا تمام تر انحصار صرف اللہ تعالیٰ کی توفیق و ہدایت پر ہے۔ وہی راہیں کھولتا ہے اور وہی مشکلوں میں رہنمائی کی روشنی دکھاتا ہے۔ پس طالبِ قرآن کا دل ہمیشہ اسی کے سامنے جھکا رہنا چاہیے جو کچھ مل جائے اس کے لیے شکر گزار ہو اور جو نہ ملے اس کے لیے امید وار رہے، نہ تو فخر کرے، نہ کبھی مایوس ہو، اور تجارت اور حصولِ شہرت کا ذریعہ تو قرآن مجید کو ہرگز نہ بنائے۔ آج جو لوگ ان راہوں سے گزرے بغیر تحقیق و اجتہاد کے مقاماتِ عالیہ تک پہنچ گئے ہیں وہ نہ تو قرآن مجید کی کوئی صحیح خدمت انجام دے سکتے ہیں اور نہ مسلمانوں کی کوئی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے فتنوں سے قرآن کو بھی محفوظ رکھے اور مسلمانوں کو بھی امان میں رکھے۔

تیسیرِ قرآن

قرآن مجید کی تعریف میں خود قرآن میں جگہ جگہ وارد ہے کہ وہ لوگوں کے لیے ہدایت ہے: 'ھُدًی لِلنَّاسِ' (البقرۃ - ۲ : ۱۸۵) (لوگوں کے لیے ہدایت)۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے نہایت آسان بنایا ہے: 'وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ' (القمر - ۵۴ : ۱۷) (اور ہم نے قرآن ذکر کے لیے آسان بنایا ہے)۔ اس میں کوئی ایچ پیچ اور الجھاؤ نہیں ہے: 'قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا غَیْرَ ذِیْ عِوَجٍ' (الزمر - ۳۹ : ۲۸) (ایک عربی قرآن جس کے اندر کوئی کجی نہیں)۔ وہ ہر بات کو کھول کر بیان کرنے والی کتاب ہے: 'تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ' (النحل - ۱۶ : ۸۹) (ہر چیز کو کھول دینے کے لیے)۔

قرآن کے مذکورہ بالا اوصاف کی بنا پر، جو اس نے خود بیان کیے ہیں، یہ کہا جاتا ہے کہ:

۱- خدا نے قرآن میں جو بات بیان کی ہے کھول کر بیان کی ہے، اس میں کوئی چیز گنجلک نہیں ہے۔

۲- قرآن مجید بذاتِ خود دنیا کے ہر طبقہ کے لیے ہدایت ہے، وہ محتاجِ تفسیر و تاویل نہیں ہے۔

۳- اس کا اندازِ بیان اس قدر واضح اور شگفتہ ہے کہ وہ مخاطب کو فہمِ مطالب

میں اپنے سوا کسی اور چیز کا محتاج نہیں بناتا۔

۴۔ صرف عربی زبان دانی قرآن دانی کے لیے بس ہے۔

۵۔ قرآن کو نہ نبی کے تشریحی بیانات کی حاجت ہے، نہ شانِ نزول کی۔ لغتِ عرب کے سوا قرآن کے معنی سمجھنے میں کسی خارجی چیز سے مدد لینا قرآن کو معنوی تحریف کے غار میں دھکیلنا ہے اور اس کی قطعیت کو برباد کر کے اس کو مظنون و موہوم بنانا ہے۔

ان تمام دعاوی کا خلاصہ دو لفظوں میں یہ ہے کہ قرآن مجید اپنی تعلیمات، اپنی زبان، اپنے اندازِ بیان، غرض ہر پہلو سے بالکل واضح ہے اس وجہ سے اس کا مخاطب اس کو سمجھنے کے لیے، عربی زبان کے علم کے سوا، کسی خارجی اعانت کا محتاج نہیں ہے

اس دعویٰ کی تائید میں، عموماً جو دلیلیں پیش کی جاتی ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ قرآن مجید، بنی نوعِ آدم کے تمام طبقات کے لیے صحیفۂ ہدایت بن کر نازل ہوا ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ جو اس پر ایمان لائے گا فلاح پائے گا اور جو اس سے اعراض کرے گا وہ ہلاک ہوگا۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس کی تعلیم و دعوت کا معیار عام عقل انسانی کے معیار کے مطابق ہو تاکہ ہر انسان جو فکر و نظر کی عام استعداد رکھتا ہے، اس کو سمجھ سکے اور اس کی تعلیمات پر عمل کر کے خالق کی خوشنودی اور اس کی رضا حاصل کر سکے۔ ایک ایسی کتاب جس کا مقصد عام تعلیم و دعوت ہو، نہ تو لفظاً اتنی مجمل اور پیچیدہ ہونی چاہیے کہ جب تک خواص اس کی مشکلات حل نہ کریں وہ سمجھ میں نہ آئے اور نہ معناً اتنی مبہم اور دقیق ہونی چاہیے کہ انسانی فہم و ادراک کی عام استعداد اس کے اسرار و رموز سمجھنے سے قاصر رہ جائے۔

۲۔ قرآن مجید سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ قطعی مانی جاتی ہے اس وجہ سے اس کی تفسیر و تاویل ایسی چیزوں کی اعانت سے مستغنی ہونی چاہیے جن کا بیشتر حصہ

ظنی ہے، مثلاً روایات واحادیث وغیرہ، ورنہ قرآن مجید کی قطعیت برباد ہوجائے گی۔

۳۔ قرآن مجید نے خود جا بجا اپنی تعریف ایسے لفظوں میں کی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کی عبارت نہایت آسان، اس کا طرزِ بیان نہایت شگفتہ، اس کا طریقِ استدلال بالکل واضح ہے، اس لیے اس کے سمجھنے میں ایک عجمی کے لیے عربی زبان کے علم کے سوا کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ مثلاً سورۂ قمر میں ہے: 'وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ' (القمر- ۵۴: ۱۷) (ہم نے قرآن ذکر کے لیے آسان بنایا ہے، پس ہے کوئی یاد دہانی حاصل کرنے والا؟)؛ سورۂ زمر میں ہے: 'قُرْآنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِي عِوَجٍ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ' (الزمر- ۳۹: ۲۸) (ایک عربی قرآن جس کے اندر کوئی کجی نہیں تاکہ وہ عذاب سے بچیں)۔

ان دلیلوں میں بہت سی غلط فہمیاں پوشیدہ ہیں جن کو آگے چل کر ہم بے نقاب کریں گے لیکن ایک حقیقت کا ہم کو بے تکلف، پہلے ہی قدم پر، اعتراف کر لینا چاہیے کہ یہ جو کچھ آج کہا جا رہا ہے یہ کسی عارضی غلط فہمی یا کسی ہنگامی غلط روی کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ قرآن مجید کی تفسیر و تاویل کا جو طریقہ، ایک عرصہ سے، مسلمانوں میں رائج و مقبول رہا ہے اس کا لازمی نتیجہ ہی یہی تھا کہ ایک زمانہ آئے جس میں اس طریقہ کے متعلق لوگوں کے دلوں میں طرح طرح کی بدگمانیاں اور شکوک پیدا ہوں اور کتابِ الٰہی کے متعلق آزادی و مطلق العنانی کا ایک ایسا فتنہ اٹھ کھڑا ہو جو پچھلے تمام فتنوں سے شدید تر اور ہلاکت انگیز ہو۔

اس اجمال کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ سمجھنے کے لیے ضرورت ہے کہ پہلے ایک نظر تفسیرِ قرآن کے مختلف ادوار اور ان کی خصوصیات پر ڈال لی جائے۔

تفسیر کے مختلف دَور اور ان کی خصوصیات:

یہ حقیقت بلا اختلاف مسلّم ہے کہ تفسیرِ قرآن کا سب سے زیادہ مبارک دور ہماری

تاریخ کا ابتدائی دور ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے تعلیم و تعلّم کے تمام ضروری شرائط و حالات اس عہد مبارک میں بدرجۂ کمال موجود تھے۔ پھر دورِ نبوت کے بعد، اسلامی تعلیمات کے زوال، عجمیت اور عجمی علوم کے اختلاط، مذاقِ زبان کے بگاڑنے بدعتوں کا فتنہ اٹھایا اور چونکہ دین کی اصلی بنیاد قرآن مجید تھا، اس وجہ سے قدرتی طور پر، اہلِ بدعت کے تیشے سب سے پہلے اسی پر پڑے۔ اس فتنہ کے سدِّباب کے لیے اہلِ سنّت اور اہلِ حق نے یہ مذہب اختیار کیا کہ تفسیر قرآن کے باب میں، تمام قیل و قال سے علیحدہ ہو کر حتّی الامکان صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم کے اقوال و آثار پر اعتماد کیا جائے تاکہ اصحابِ بدعت کو کتابِ الٰہی میں دراندازی کا کوئی راستہ نہ ملے۔

یہ حقیقت میں ایک فتنہ کے سدّباب کے لیے ایک وقتی تدبیر اور ایک بیماری کی مناسبِ وقت دوا تھی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ جو جماعت اپنی بدعات کی حمایت و تائید میں قرآن کو ساتھ لینا چاہتی ہے اس کے لیے یہ راہ مسدود ہو جائے۔

اس اصولِ تفسیر کی جو سب سے زیادہ جامع اور عظیم الشّان کتاب تالیف ہوئی وہ علامہ ابنِ جریر رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر ہے۔ اس میں وہ سب کچھ یکجا جمع ہے جو سلف سے بطریقِ روایت منقول ہے۔ ان کا طریقہ یہ ہے کہ ہر آیت کے تحت سلف کے تمام اقوال، بغیر کسی جرح و نقد کے، جمع کر دیتے ہیں اور جو قول ان کے نزدیک ترجیح کے قابل ہوتا ہے اخیر میں اس کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔ حتّی الامکان اس قول کو ترجیح دیتے ہیں جو دوسرے تمام اقوال کو اپنے اندر جمع کر لے، جابجا لغت و نحو سے بھی استدلال کرتے ہیں۔ لیکن نہ تو اس میں روایات کی تنقید ہے نہ قرآن پر قرآن یا تاریخ یا عقل وغیرہ کے پہلو سے کوئی بحث کی گئی ہے۔ اس سبب سے اس میں جو جواہر ریزے ہیں وہ منکر اور ضعیف روایات کے انبار میں گم ہیں اور جب تک خود قرآن یا عقل کی

روشنی رہنمائی نہ کرے ان کا سراغ لگانا مشکل ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر اس عظیم الشان تصنیف سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی پوری تنقید کے ساتھ اس کا مطالعہ کرے۔ مؤلف رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی اس کتاب میں صرف روایات کو جمع کر دینے کی خدمت انجام دی ہے، نقد و نظر کا کام اہلِ نظر کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ اگر یہ خدمت بھی وہ اپنے سر لے لیتے تو شاید روایات و آثار کا ایسا عظیم الشان ذخیرہ ہم کو ہاتھ نہ آسکتا۔ ابھی حال ہی میں ان کے حالات میں کہیں یہ پڑھ کر تعجب ہوا کہ ان کے ذخّارِ قلم نے جو سرمایہ فراہم کر دیا ہے، اگر ان کی تصنیفی عمر کو سامنے رکھ کر، اس کا حساب لگایا جائے تو روزانہ چالیس صفحہ کا اوسط پڑے گا۔ ایک ایسا سبک عنان قلم اگر جمع و تالیف کے ساتھ ساتھ نقد و نظر کے الجھاؤ میں بھی پھنس جاتا تو یقیناً سلف کے اقوال کے ایک بڑے حصّہ سے ہم محروم ہو جاتے۔

اس کے بعد سب سے زیادہ مشہور و مقبول تفسیر علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ لیکن یہ حقیقت میں تفسیر ابنِ جریر کا خلاصہ ہے۔ صرف اتنی بات اس میں نئی ہے کہ محدّثانہ طریق پر اس میں روایات کی تنقید کی گئی ہے۔ اس کے سوا قرآن مجید کے فہم و تدبّر کے دوسرے اصولوں سے اس میں بھی کوئی تعرّض نہیں کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ صرف اس قدر تبدیلی کچھ زیادہ مفید مقصد نہیں ہے۔

تفسیر کی تیسری اہم کتاب امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر ہے۔ یہ تفسیر متکلمانہ نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے اور اس میں شبہ نہیں ہے کہ اس اعتبار سے یہ لاجواب کتاب ہے۔ لیکن یہ کلامی بحثیں اس پر اس قدر حاوی ہو گئی ہیں اور اشعریّت کی حمایت کے لیے امام صاحب نے اس میں قرآن مجید کو اس بے دردی کے ساتھ استعمال کیا ہے کہ فہم قرآن کے لیے یہ کتاب نہ صرف یہ کہ کچھ مفید نہیں رہ گئی ہے، بلکہ نہایت مضر بن گئی ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص متکلمانہ قیل و قال اور اشعریّت و اعتزال کے معرکوں سے دلچسپی رکھتا ہو یا یہ

معلوم کرنا چاہتا ہو کہ متکلمین نے قرآن کو کس طرح سمجھا ہے تو اس کے لیے یہ بہترین کتاب ہے۔

تفسیر کی چوتھی اہم کتاب علامہ زمخشری رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کشاف ہے۔ اس کا طریقہ مذکورہ کتابوں سے بالکل الگ ہے۔ علامہ زمخشری کی نظر کا محور عموماً عبارتِ قرآن ہوتی ہے۔ یہ پہلے لغت، اعراب اور ربطِ کلام سے بحث کرتے ہیں پھر احتیاط کے ساتھ روایات بھی لاتے ہیں۔ ان کی ایک خصوصیت نہایت قابلِ قدر ہے کہ وہ لغت و اعراب میں عموماً صحیح مذہب اختیار کرتے ہیں۔ اس چیز میں امام رازیؒ بھی ان کا لوہا مانتے ہیں، یہاں تک کہ باوجود ان کے ساتھ حریفانہ کاوش کے، ان کی لغوی و نحوی تحقیقات کو امام رازیؒ اکثر اپنی کتاب میں، بلاتکلف بغیر کسی تغیّر و تصرف کے نقل کر دیتے ہیں۔ ان اعتبارات سے یہ کتاب قرآن مجید کے طالب علموں کے لیے مفید ہے۔ لیکن امام رازیؒ جس طرح اشعریت کے علم بردار ہیں، اسی طرح علامہ زمخشریؒ مذہبِ اعتزال کے وکیل ہیں۔ اور کتابِ الٰہی کے ساتھ سب سے بڑی ناانصافی یہی ہے کہ اس کے پیچھے چلنے کے بجائے آدمی اس بات کی کوشش کرے کہ اس کو خود اپنے کسی فکر و خیال کے پیچھے چلائے۔

تفسیر کی مرکزی کتابیں یہی ہیں جو عام طور پر اہلِ علم کے پیشِ نظر رہتی ہیں۔ ان کے علاوہ جو کتابیں ہیں وہ درحقیقت انہی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ بعض تفسیریں تصوّف کے رنگ میں بھی لکھی گئی ہیں۔ لیکن ان کے نہجِ استدلال اور طریقِ بحث و نظر میں ایک مخصوص فوقی رنگ غالب ہے جس کو وہ لوگ نہیں قبول کر سکتے جو قرآن مجید کو روایات یا الفاظ و لغات کی روشنی میں سمجھنا چاہتے ہیں۔ اس قسم کی تفسیریں ہماری نظر سے کم گزری ہیں[1] اس لیے ہم ان کی نسبت کوئی سنجیدہ رائے نہیں دے سکتے۔ لیکن عام مطالعہ میں بعض اکابر صوفیہ

---

[1] استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ امام قشیریؒ کی تفسیر کا کبھی کبھی اچھے الفاظ سے ذکر فرمایا کرتے تھے۔ میں نے حیدر آباد (دکن) میں اس کو کہیں کہیں سے دیکھا لیکن کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ ممکن ہے کہ اس کا زیادہ حصہ پڑھنے کا موقع ملتا تو اس کا وہ پہلو معلوم ہو سکتا جس پہلو سے مولانا اس کا ذکرِ خیر کرتے تھے۔

کے جو اقوال نظر سے گزرے ہیں ان سے نہایت مایوسی ہوتی ہے۔ مثلاً ایک بزرگ، جو سرخیلِ حلقۂ تصوف ہیں، "اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ٥ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ" (البقرۃ - ۲ : ۶-۷) (جن لوگوں نے کفر کیا، ان کے لیے یکساں ہے ڈراؤ یا نہ ڈراؤ، وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے، اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے) کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ جنہوں نے اللہ کا ایمان اپنے دلوں میں چھپالیا، ان کو ڈراؤ یا نہ ڈراؤ وہ ایمان نہ لائیں گے، کیونکہ وہ میرے سوا کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایمان بھر کر ان پر مہر لگا دی ہے، اب اس میں کسی اور کی سمائی باقی نہیں رہی ہے[1]۔ ممکن ہے یہ اقوال غلط منسوب کر دیے گئے ہوں اور خدا کرے ایسا ہی ہو، لیکن یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ تفسیر سے متعلق اہلِ تصوف کے جو اقوال عموماً کتابوں میں ملتے ہیں ان پر ذوقی رنگ غالب ہے، بلکہ ایک حد تک ان میں باطنیت کی بو پائی جاتی ہے جس کے لیے لغت و زبان سے انحراف لازمی ہے۔ جن لوگوں نے اس رنگ کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے وہ ہماری اس رائے سے شاید اختلاف نہ کر سکیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ دورِ اوّل کے بعد تفسیرِ قرآن کی راہ میں جو پہلا ہی قدم اٹھایا گیا وہی غلط تھا۔ اس کا محرّک اگرچہ ایک اچھا خیال تھا، لیکن افسوس ہے کہ اس کے نتائج خاطر خواہ نہیں نکلے، بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک فتنہ کا دروازہ بند کرنے کی کوشش کی گئی اور ساتھ ہی ایک دوسرے فتنہ کا دروازہ کھول دیا گیا۔ اہلِ بدعت اور اصحابِ باطل کی مطلق العنانیوں اور فتنہ آرائیوں سے بچنے کے لیے روایات و آثار

---

[1] الفتوحات المکیۃ لابن العربی : ج ۱، ص ۱۱۵

کو اہمیت دی گئی، لیکن پھر روایات میں اس درجہ انہماک بڑھ گیا کہ ان کے بارہ میں نقد و تمیز کی آنکھیں بند ہوگئیں اور آہستہ آہستہ صحیح روایات کے ساتھ قصّوں اور اسرائیلیات کا ایک بڑا حصّہ بھی تفسیر کی کتابوں میں داخل کر دیا گیا۔

جرح و نقد سے بے پروائی کا ایک افسوسناک نتیجہ یہ ہوا کہ ہر آیت کے متعلق صحیح اور غلط اقوال کا ایک ایسا انبار جمع ہو گیا کہ کسی آیت کی صحیح تاویل معلوم کرنا نہایت مشکل ہو گیا اور لوگ بجائے اس کے کہ صحیح اور غلط میں امتیاز کر کے اس مشکل کو آسان کرنے کی کوشش کرتے وہ ہر آیت کے بارہ میں بہت سے اقوال کو نقل کر دینا ہی کمال قرآن سمجھنے لگے۔ حالانکہ یہ موٹی سی بات ہر عقل سمجھ سکتی ہے کہ ایک آیت کے متعلق صحیح بات صرف ایک ہی ہو سکتی ہے۔ لیکن اولاً تو روایات کی تنقید کا کام کوئی سہل کام نہیں تھا، ثانیاً صحیح روایات سے جو اقوال ثابت ہوں ان میں سیاق و سباق اور الفاظ و نظم کی مدد سے کسی ایک قول کو ترجیح دینا اس سے بھی زیادہ مشکل تھا، اس وجہ سے لوگوں نے پناہ اسی میں دیکھی کہ جو کچھ نقل ہے اسے جوں کا توں نقل کرتے رہیں اور اپنی عقل کو تنقید و تمیز کے دردِ سر سے بچا لے جائیں۔

ظاہر ہے کہ تفسیر میں صرف روایات ہی پر پورا پورا اعتماد کر لینا قرآن مجید کی قطعیت کو نقصان پہنچانا ہے۔ اس صورت میں خود قرآن مجید کے الفاظ کا فیصلہ باطل ہو جاتا ہے اور تمام دار و مدار صرف روایات پر رہ جاتا ہے اور روایات بھی تفسیر کی روایات جن کے متعلق ناقدینِ روایت کا یہ فیصلہ معلوم ہے کہ ان میں روایت کے عام اصولوں کی پروا بہت کم کی گئی ہے۔

بعد کے دور میں فلسفہ و کلام کے زور پکڑ جانے کی وجہ سے جب قرآن کی بارگاہِ قدس میں کلامی جدلیات اور فلسفیانہ موشگافیوں کو باریابی حاصل ہوئی تو یہ الجھاؤ اور زیادہ بڑھ گیا۔ اب تک تو خیریت تھی کہ قرآن مجید کی تاویل صرف روایات ہی پر منحصر تھی،

ہر بات کا سلسلہ صحیح یا غلط طور پر ابنِ عباسؓ، مجاہدؒ، قتادہؒ وغیرہم تک پہنچتا تھا، لیکن اب وہ لوگ بھی شریکِ بزم ہوگئے جو نقل سے زیادہ عقل کے دلدادہ اور قرآن مجید کی ہر آیت کو اپنے قالب میں ڈھالنے کے شائق تھے۔ الفاظِ قرآن کی حکومت پہلے ہی اٹھ چکی تھی، اس وجہ سے ان کی راہ میں روایات و آثار کے حصار کے سوا کوئی روک نہ تھی۔ یہ حصار مذہبی تقدس اور عام ہر دلعزیزی کی وجہ سے محترم خیال کیا جاتا تھا، اس وجہ سے اس کو یک قلم ڈھا دینا ممکن نہیں تھا۔ اس مشکل کو انہوں نے یوں حل کیا کہ روایات و آثار کے وافر ذخیرہ میں سے ہر گروہ نے اتنا اتنا لے لیا جتنا اس کے مذاق اور اس کی خواہش کے موافق اس کو نظر آیا، باقی کو بغیر ہاتھ لگائے اپنے حریفوں کے لیے چھوڑ دیا۔ جو آیتیں اپنے قرار دادہ مذہب کے موافق معلوم ہوئیں ان کو اپنی تائید میں استعمال کر لیا اور جو بظاہر کسی قدر مخالف نظر آئیں ان کو آیاتِ متشابہات کی فہرست میں داخل کر دیا۔ اس طرح ایک ہی آیت ایک فریق کے نزدیک محکم بن گئی اور دوسرے فریق کے نزدیک متشابہ منسوخات کے سلسلہ میں قرآن کا ایک بڑا حصہ امت کے لیے بے مقصد ہو ہی چکا تھا اس فرقہ وارانہ تقسیم نے ایک اور بڑے حصہ کو آیاتِ متشابہات کی فہرست میں داخل کر دیا۔

اس اختلاف و نزاع نے آگے بڑھ کر ایک اور فتنہ اٹھایا، یعنی سرے سے تمام لفظی دلائل کی قطعیت ہی مشتبہ و مشکوک ہوگئی اور لوگوں میں یہ خیال پھیل گیا کہ چونکہ زبان اور کلام کی بنیاد تمام تر نقل پر ہے اور نقل ایک ظنی چیز ہے، اس وجہ سے الفاظ کی دلالت قطعی نہیں ہو سکتی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو آیتیں اپنے مفہوم میں بالکل ظاہر تھیں ان کو بھی، اگر کسی جماعت نے اپنے اختیار کردہ مذہب کے خلاف پایا، آیاتِ متشابہات کی صف میں داخل کر دیا۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں:

اعلم ان هذا موضع — یہ ایک نہایت اہم مقام ہے۔

عظیم فنقول: ان کل واحد من اصحاب المذاهب یدعی ان الآیات الموافقة لمذهبه محکمة وان الآیات المحکمة الموافقة لقول خصمه متشابهة۔ فالمعتزلی یقول: قوله تعالیٰ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ محکم وقوله وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ متشابه والسنی یقلب الامر فی ذالك فلابد ههنا من قانون یرجع الیه[1]۔

ہر فرقہ دعویٰ کرتا ہے کہ جو آیتیں اس کے مذہب کے موافق ہیں وہ محکم ہیں اور جو اس کے فریق کے مذہب کے موافق ہیں وہ متشابہ ہیں۔ معتزلی کا دعویٰ ہے کہ تو جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کفر کرے، محکم ہے اور "اور تم نہیں چاہ سکتے مگر یہ کہ اللہ چاہے"، متشابہ اور اہلِ سنت اس کے برعکس دعویٰ کرتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ اس کے متعلق کوئی قانون بنایا جائے۔

یہ قانون امام رازیؒ کے نزدیک، خود ان کے الفاظ میں، یہ ہے:

فنقول: اللفظ اذا کان محتملاً لمعنیین وکان بالنسبة الی احدهما راجحاً وبالنسبة الی الآخر مرجوحاً فان حملناه علی الراجح ولم نحمله علی المرجوح فهٰذا

ہم کہتے ہیں کہ جب کوئی لفظ دو معنوں کا متحمل ہو اور ایک معنی میں راجح اور دوسرے معنی میں مرجوح ہو اور ہم مرجوح سے ہٹ کر اس کو راجح پر محمول کریں تو یہ محکم ہے اور

---

[1] التفسیر الکبیر: ج ۷، ص ۱۸۰-۱۸۱

هو المحكم واما ان حملناه على المرجوح ولم نحمله على الراجح فهذا هو المتشابه. فنقول صرف اللفظ عن الراجح الى المرجوح لابد فيه من دليل منفصل و ذالك الدليل اما ان يكون لفظيًا و اما ان يكون عقليًا[1].

اگر ہم راجح سے ہٹ کر مرجوح پر محمول کریں تو یہ متشابہ ہے۔ پس ہم کہتے ہیں کہ لفظ کو راجح سے مرجوح کی طرف ہٹانا کسی علیحدہ دلیل کا محتاج ہے اور یہ علیحدہ دلیل یا تو لفظی ہو گی یا عقلی۔

اب لفظی دلائل کے بارے میں امام رازیؒ کا فتویٰ سنیئے :

لان الدلائل اللفظية لا تكون قاطعة البتة لان كل دليل لفظي فانه موقوف على نقل اللغات ونقل وجوه النحو والتصريف وموقوف على عدم الاشتراك وعدم المجاز وعدم التخصيص وعدم الاضمار وعدم المعارض النقلي والعقلي وكل ذالك مظنون والموقوف على المظنون اولىٰ ان يكون مظنونا فثبت ان شيئا من الدلائل اللفظية لا يكون قاطعا[2].

لفظی دلائل ہرگز قطعی نہیں ہو سکتے کیونکہ ہر دلیل لفظی، لغات اور وجوہ نحو و صرف کے نقل اور عدم اشتراک، عدم مجاز، عدم تخصیص و عدم اضمار اور عدم معارض عقلی و نقلی پر مبنی ہے اور ان میں سے ہر چیز مظنون پر موقوف ہے اور جو چیز مظنون پر موقوف ہے وہ بدرجۂ اولیٰ مظنون ہے اس سے ثابت ہوا کہ لفظی دلائل ہرگز قطعی نہیں ہو سکتے۔

---

[1] التفسیر الکبیر: ج ۷، ص ۱۸۱

[2] التفسیر الکبیر: ج ۷، ص ۱۸۱

نقلی دلائل کے ظنی و غیر معتبر ہو جانے کے بعد صرف ایک چیز باقی رہ گئی تھی، یعنی عقل۔ لیکن عقل بھی وہ عقل نہیں جو اللہ تعالٰی نے ہر انسان کو بخشی ہے، بلکہ وہ عقل جو منطقی خیال آرائیوں اور کلامی موشگافیوں کی عادی ہو، اس طرح قرآن کی باگ کلامی جدلیات کے ہاتھ میں چلی گئی۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں امام رازیؒ فرماتے ہیں:

فاذا کانت المسئلۃ قطعیۃ یقینیۃ کان القول فیھا بالدلائل الظنیۃ الضعیفۃ غیر جائز۔ مثالہ قال اللہ تعالٰی ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا﴾ (البقرۃ - ۲ : ۲۸۶) قام الدلیل القاطع علی ان مثل ھذا التکلیف قد وجد علی ما بینا بالبراھین الخمسۃ فی تفسیر ھذہ الآیۃ۔ فعلمنا ان المراد للہ تعالٰی لیس مایدل علیہ ظاھر ھذا الآیۃ۔[1]	جب کہ ایک مسئلہ اپنی جگہ پر قطعی یقینی ہو تو اس کے بارہ میں ظنی اور کمزور دلائل کی بنا پر کچھ کہنا ناجائز ہے۔ مثلاً ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا﴾ (اللہ تعالٰی کسی جان پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا) کے متعلق قطعی دلائل سے ثابت ہو چکا ہے کہ اس قسم کی تکلیف مالا یطاق اللہ تعالٰی اپنے بندوں کو دیتا ہے۔ ہم اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں اس کی تائید میں پانچ نہایت محکم دلیلیں لکھ چکے ہیں۔ پس ظاہر ہے کہ اس سے اللہ تعالٰی کی مراد وہ نہیں ہو سکتی جو ظاہر آیت سے معلوم ہوتی ہے۔

امام رازیؒ اور تمام اشاعرہ اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ تعالٰی بندوں کو تکلیف مالا یطاق دیتا ہے یعنی ان پر وہ بوجھ ڈالتا ہے جس کے اٹھانے کی قابلیت اس

---

[1] التفسیر الکبیر

نے اس کے اندر نہیں رکھی ہے اس مسئلہ کی تائید میں انہوں نے سورۂ بقرہ کی آیت ۶ اور مذکورہ بالا آیت کے تحت متعدد دلیلیں بیان کی ہیں۔ اس کے علاوہ تفسیر میں جہاں کہیں ضرورت محسوس کی ہے اس کے دلائل کی تفصیل کی ہے، لیکن مذکورہ آیت ان کو اپنے مذہب کے صریح خلاف اور حریفوں یعنی معتزلہ کے مذہب کی علانیہ مؤید نظر آئی۔ اس سے بچنے کے لیے انہوں نے اولاً تو اس کے نظم کو الٹا پلٹا، لیکن جب اس سے تشفی نہ ہوئی تو اپنی براہنیات کا ترکش سنبھالا، لیکن تمام ترکش خالی کر دینے کے بعد جب اس سے بھی قلب کو پورا اطمینان نہ ہوا تو وہ شمشیر آب دار بے نیام کی جس کی کاٹ کے لیے کوئی سپر نہیں تھی۔ یعنی یہ اعلان کر دیا کہ اگرچہ آیت کے الفاظ صاف صاف پکار رہے ہیں کہ خدا بندوں کو تکلیف مالایطاق نہیں دیتا ہے، لیکن جب ایک دو نہیں، بلکہ پانچ پانچ عقلی دلیلوں سے ثابت ہو چکا ہے کہ خدا تکلیف مالایطاق دیتا ہے تو قرآن کی ایک آیت جس کے الفاظ کی دلالت بالکل ظن وسماع پر مبنی ہے، اس ۔۔۔م قلعہ کو کس طرح منہدم کر سکتی ہے؟

کورہ بالا تفصیلات سے مندرجہ ذیل نتائج مستنبط ہوتے ہیں:

۱۔ صدرِ اوّل کے بعد تفسیرِ قرآن کے باب میں تمام تر اعتماد روایات و آثار پر رہ گیا اور اس میں اس قدر غلو ہوا کہ حق و باطل اور رطب و یابس کی سرے سے تمیز ہی اٹھ گئی۔ ہر طرح کے قصتے اور اسرائیلیات تفسیر کی کتابوں میں جگہ پا گئے اور ان روایات پر اس درجہ اعتماد کر لیا گیا کہ خود قرآن کے الفاظ کی دلالت بالکل بے معنی ہو کے رہ گئی۔

۲۔ علمِ کلام کے غلو نے قرآن مجید کی قطعیت کو اور زیادہ مشتبہ کر دیا۔ کیونکہ متکلّمین کے نام نہاد عقلی دلائل کے مقابل میں خود قرآن کے الفاظ کی دلالت بالکل بے وزن ہو کے رہ گئی اور تفسیر میں تمام تر بھروسہ ان "براہنیات" پر رہ گیا جو ہمارے متکلّمین

کے ذہنوں کی پیداوار تھیں۔

ردِّ عمل :

جن لوگوں نے ان تفسیروں کی مدد سے قرآن مجید کو سمجھنا چاہا، ان کو ان باتوں کی وجہ سے جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، سخت مایوسی ہوئی اور زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ یہ مایوسی بڑھتی رہی، یہاں تک کہ یہ حالات پیش آگئے جن سے آج ہم دوچار ہیں۔ یعنی ایک جماعت نے پوری قوت کے ساتھ روایات اور احادیث کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ صحابہؓ قرآن مجید کو، اس کے الفاظ کی روشنی میں سمجھتے تھے، ان کو نہ تو روایات کی ضرورت پیش آئی نہ وہ ان متکلمانہ برہانیات کے محتاج ہوئے، پھر آج قرآن مجید کا سمجھنا سمجھانا ابن جریر، امام رازی، قاضی بیضاوی اور امام سیوطی کی کتابوں پر کیوں منحصر ہو جائے؟

ان خیالات کو اُن لوگوں نے مزید آب و رنگ دے کر چمکایا جو مغربی خیالات سے مرعوب تھے۔ یہ لوگ قرآن مجید یا خود شریعتِ اسلام کے متعلق جو سنی سنائی باتیں جانتے تھے، وہ ان کے مذاق اور ان کی عقل پر پوری نہیں اترتی تھیں اور جو کچھ نہیں جانتے تھے اس کے نہ جاننے کا ننگ گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، اس لیے سرے سے اس کے وجود ہی سے انکار کر دیا کہ نہ اس کے وجود کو تسلیم کریں گے نہ اس کی عدمِ واقفیت کی شرمندگی اٹھانی پڑے گی۔ ان لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ قرآن مجید تو ایک نہایت آسان اور سادہ کتاب ہے، اس کے مخاطبِ اوّل عرب تھے جو بالکل وحشی اور بدوی تھے اور صرف موٹی موٹی باتیں ہی سمجھ سکتے تھے، ایسی قوم کو ایک ایسی کتاب دینا، جس کے اسرار و رموز کی نسبت یہ کہا جاتا ہو کہ اس کے عجائب کبھی ختم نہ ہوں گے ایک بے معنی اور مہمل بات اور خدا کی حکمت کے بالکل منافی

ہے۔ قرآن مجید دنیا کے تمام انسانوں کے لیے صحیفۂ رشد و ہدایت بن کر نازل ہوا ہے اس لیے ضروری ہے کہ وہ نہایت سہل ہو۔ اگر وہ دقیق اسرار پر مشتمل ہوگا تو دنیا اس کے فوائد سے محروم رہ جائے گی، اور بندوں پر اللہ تعالیٰ کی حجت قائم نہ ہو سکے گی۔ اس خیال کی تائید میں وہ ان آیتوں سے سند پکڑتے ہیں جن میں ایسے الفاظ آئے ہیں جو، ان کے زعم میں، قرآن مجید کے سہل اور آسان ہونے کو ظاہر کرتے ہیں، اس کے بعد حدیثوں اور روایتوں سے وہ یہ کہہ کر پیچھا چھڑا لیتے ہیں کہ یہ ظنیات ہیں اگر قرآن مجید کی تاویل و تفسیر کی بنیاد ان ظنیات پر رکھی گئی تو قرآن کی قطعیت برباد ہو جائے گی۔ اس طرح وہ بے روک ٹوک اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ قرآن کے سمجھنے کے لیے عربی زبان کے علم کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے۔

ان تمام خیالات کو سامنے رکھتے ہوئے اب ہماری معروضات سنیے:

کلام کے مشکل اور آسان ہونے کے تین پہلو:

کسی کلام پر مشکل اور آسان ہونے کا حکم تین اعتبارات سے لگایا جا سکتا ہے:

۱۔ خود کلام کے اعتبار سے یعنی اگر کسی کلام میں الفاظ نامانوس ہوں، عبارت میں پیچیدگی ہو، قواعدِ نحو و صرف اور محاورۂ عام کی مخالفت ہو، اس میں استعارات دور از کار، تلمیحات بعید از فہم، تشبیہات غیر واضح اور کنایات ناقابلِ فہم ہوں تو وہ کلام مشکل ہوگا۔ برعکس اس کے الفاظ و محاورات معروف ہوں، جملوں کی ترتیب اور ترکیبوں کی نشست میں کوئی اینچ پینچ نہ ہو، قواعدِ زبان کے مروّج اصولوں کی پوری رعایت ہو تو وہ کلام شستہ، پاکیزہ، سہل اور آسان ہوگا۔ غالب کے کلام کا جو حصہ بیدل کے رنگ میں ہے وہ ہر شخص کو مشکل اور بے مزہ معلوم ہوتا ہے، لیکن جس حصہ میں خود ان کا اپنا رنگ ہے اس کا ایک ایک مصرعہ سادگی، بلاغت اور دل نشینی

کی نہایت عمدہ مثال ہے۔

۲۔ مضمون کے اعتبار سے بعض مضامین خود سہل ہوتے ہیں، مثلاً قصے، تاریخ، ناول، افسانے اور قانون وغیرہ۔ بعض مشکل ہوتے ہیں، مثلاً فلسفہ، منطق، اقلیدس، ریاضی، معاشیات وغیرہ۔ پہلی قسم کے مضامین زیادہ غور و فکر کے محتاج نہیں ہوا کرتے، ان کو ہر شخص پڑھتا ہے اور آسانی سے سمجھ لیتا ہے، لیکن فلسفہ کی کسی کتاب کو کوئی شخص ناول کی روانی کے ساتھ پڑھ کر نہیں سمجھ سکتا۔

۳۔ مخاطب کے اعتبار سے غالب کی ایک سادہ غزل ایک ابجد خواں کے لیے نہایت مشکل ہے، لیکن اگر ایک ماہرِ فن کے سامنے ان کے مشکل اشعار بھی پیش کیجیے تو وہ آسانی سے سمجھ لے گا۔

ان امور کو پیشِ نظر رکھ کر اب قرآن مجید کے سہل و آسان ہونے پر غور کیجیے۔ قرآن مجید ایک ایسا کلام ہے جس کی بلاغت کی تمام عرب و عجم، بلکہ سماء و دنیا کے نیچے کوئی دوسری نظیر نہیں ہے۔ ایسے کلام کی نسبت پہلے اعتبار سے تو ظاہر ہے کہ کوئی بحث ہو نہیں سکتی کیونکہ کلام کا یہ عیب متکلم کی عدم قدرت کا نتیجہ ہوا کرتا ہے اور قرآن مجید جس کا کلام ہے وہ جملہ عیوب سے پاک ہے، اس لیے قرآن مجید جس زمانہ میں اترا ہے اس زمانہ کی فصاحت و بلاغت کی تمام خوبیوں کا حامل ہے، یہاں تک کہ اس کے مخاطب جو دنیا میں کلام کے بہترین نقاد تھے، اس کے ایک ایک حرف سے بیزار ہونے کے باوجود یہ اعتراف کرتے تھے کہ یہ سحر ہے۔ قرآن نے ان سے مطالبہ کیا کہ اس کے مثل تم ایک ہی سورہ لاؤ اور اس کے لیے تم اپنی تمام ارضی و سماوی قوتیں فراہم کر لو، اس مطالبہ کا ان کے پاس اس کے سوا کوئی جواب نہ تھا کہ یہ جادو ہے۔

ایک ایسے کلام میں نحو و صرف کے عام قواعد کی رعایت، نامانوس الفاظ و محاورات سے اجتناب، تعقیدات اور عقل آزما ابہامات سے احتراز اور اس قبیل کی دوسری

خوبیاں اس قدر ابتدائی درجہ کی چیزیں ہیں کہ ان کی نسبت سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ پس اس اعتبار سے بلا شبہ یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید نہایت کھلا ہوا اور آسان ہے۔

اب دوسرے پہلو سے غور کیجیے، **یعنی موضوع و مضمون کے اعتبار سے**۔ قرآن مجید اپنے موضوع اور مضامین کے اعتبار سے کلام کی کس صنف میں داخل ہے؟ جو لوگ قرآن مجید کی گوناگوں خصوصیات سے اچھی طرح آشنا ہوں گے وہ اس کا جواب یہی دے سکتے ہیں کہ وہ مذکورہ بالا دونوں صنفوں سے بالکل الگ چیز ہے۔ لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ مسلمانوں میں اس کے متعلق عام طور پر ایک مبہم سا خیال یہ پیدا ہوگیا ہے کہ یہ احکام و قوانین کا ایک مجموعہ ہے۔ اس غلط فہمی میں جس طرح عوام مبتلا ہیں اسی طرح بہت سے علماء بھی مبتلا ہیں۔ جدید تعلیم یافتہ لوگ بھی اسی قسم کی غلط فہمی کے شکار ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ لوگ دین کے متعلق اس سے زیادہ بلند تصور ہی نہیں کر سکتے کہ وہ حرام و حلال کے بتانے کا ایک ضابطہ ہے۔ چنانچہ بہت سے لوگ فقہ کی جزئیات و کلیات علیحدہ مرتب ہو جانے کے بعد قرآن مجید کی تلاوت محض تبرکاً ہی ضروری سمجھتے ہیں، علم و یقین پیدا کرنے اور ذہن و فکر کی ترتیب کے نقطۂ نظر سے اس کو کچھ زیادہ سود مند نہیں خیال کرتے۔ ان خیالات کے پیدا ہونے اور پھیلنے کی ایک تاریخ ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ تاہم بعض وجوہ کی طرف اشارہ ناگزیر ہے۔

پہلی وجہ ہمارے علماء کی یہ عام غلط فہمی ہے کہ دین میں عقل کو دخل نہیں ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ ہم جن باتوں پر ایمان لاتے ہیں پیغمبر کے کہنے سے ایمان لاتے ہیں اور پیغمبر کو کسی عقلی دلیل سے نہیں بلکہ معجزہ کے ذریعے سے پہچانتے ہیں۔ اگر دین میں عقل کو دخل ہوتا تو وحی کی کیا ضرورت تھی اور ایمان بالغیب کی تعریف کیوں کی جاتی؟ ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے نزدیک دین اس قدر سادہ اور حقیر چیز ہو وہ قرآن مجید کو چند اوامر و

چند نواہی کے ضابطہ سے زیادہ وقعت نہیں دے سکتے اور اس طرح کے ضابطہ کو سمجھنے کے لیے یقیناً کسی خاص غور و تدبر کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر شخص اس کو پڑھ کر نہایت آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے۔

دوسری وجہ یونانی علوم کا رواج ہے۔ جو لوگ فلسفہ و منطق کے مطالعہ میں مشغول ہوئے انہوں نے قرآن مجید کو کرنے اور نہ کرنے کی باتوں کے ایک منتشر مجموعہ اور وعظ و نصیحت کے ایک خشک دفتر سے زیادہ وقعت نہ دی۔ وہ نہایت لپست اور راہِ فطرت و ہدایت سے ہٹی ہوئی عقلیات میں الجھ گئے اور انہوں نے یہ گمان کرلیا کہ توحید و رسالت کے مسائل پر فلسفہ ہی سے دلیل لائی جا سکتی ہے۔ مذہب خود اپنی حمایت سے عاجز ہے۔ اس وہم نے ان لوگوں کو قرآن مجید سے بہت دور کردیا ہے اور چونکہ یونانی عقلیات نے ایک طویل زمانہ تک ذہنوں اور دماغوں پر فرمانروائی کی تھی، اس وجہ سے ان کا رعب دلوں پر اس قدر چھایا ہوا رہا کہ اگر کسی پر قرآن کی اصلی عظمت کچھ بے نقاب

تیسری وجہ عربوں کی جہالت کا وہ عام اعتقاد ہے جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کرچکے ہیں۔ افسوس ہے کہ عربوں کے متعلق علماء اور نئے تعلیم یافتہ حضرات سب ہی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ ہمارے علماء کے نزدیک تو اسلام اور قرآن کا کمال ظاہر ہو ہی نہیں سکتا جب تک عربوں کو چوپایوں سے بھی بدتر نہ ثابت کردیں۔ رہے نئے تعلیم یافتہ حضرات تو یہ لوگ بھی زمانۂ نزولِ اسلام کے جاہل اور وحشی عربوں میں کسی طرح کی ذہنی و دماغی صلاحیت و استعداد کا تصور نہیں رکھتے۔ ان لوگوں کا خیال یہ ہے کہ قرآن مجید صرف چند احکام اور چند مواعظ کا سیدھا سادا مجموعہ ہے اس لیے اگر کوئی شخص کسی عربی اخبار یا رسالہ کا غلط صحیح ترجمہ کرسکتا ہے تو وہ قرآن مجید کی تفسیر لکھنے کا بھی حق رکھتا ہے۔ حالانکہ عربوں کے متعلق یہ نہایت غلط خیال ہے۔ جس شخص نے ان کے ادب کا تھوڑا بہت بھی مطالعہ کیا ہوگا وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ ذہنی اعتبار

ہوئی بھی تو وہ عام خیال کے خلاف کچھ بولنے کی جرأت نہ کر سکا۔

سے عرب زمانۂ جاہلیت میں بھی اپنی دوسری معاصر قوموں سے کسی طرح پیچھے نہیں تھے۔

الغرض عوام اور خواص، دونوں نے قرآن مجید کو اس کے اصلی رتبہ سے بہت نیچے گرا کر دیکھا۔ عوام دل کی خلشوں اور عقل کی اُلجھنوں سے آزاد ہوتے ہیں اور دین کو محض تقلیداً مانتے ہیں۔ ان کو دین کی ضرورت صرف اس لیے ہوتی ہے کہ حرام و حلال کو معلوم کرلیں اور مذہب کے ظاہری رسوم و فرائض سے آشنا ہو جائیں۔ اس ضرورت کے پوری ہو جانے کے بعد نہ مزید کسی شے کی ان کو ضرورت ہے اور نہ اس سے زیادہ وہ کسی چیز کا تصور کر سکتے۔ باقی رہے علماء تو وہ عموماً اس بدگمانی کی وجہ سے قرآن مجید کی طرف متوجہ نہ ہو سکے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ انہوں نے قرآن مجید کو صرف ایک مجموعۂ احکام و قوانین کی حیثیت سے دیکھا، جس میں ضمناً بطور پند و موعظت کے گزشتہ قوموں کے قصے اور گمراہ فرقوں کے اعمال و عقائد وغیرہ بھی بیان ہو گئے ہیں اور کہیں کہیں توحید و معاد وغیرہ کی وہ موٹی موٹی دلیلیں ذکر کر دی گئی ہیں جو عوام کے لیے کافی ہو سکیں۔ جو لوگ قرآن کو معجزہ کی بنیاد پر مانتے تھے ان کو تو اس سے زیادہ کی سرے سے کوئی طلب ہی نہیں تھی، مگر جنہوں نے اس سے زیادہ کی ضرورت سمجھی بھی تو وہ قرآن کی جگہ یونانی علوم میں مشغول ہو گئے۔

قرآن کا مقصدِ نزول :

قرآن مجید کے متعلق اس سے زیادہ مہلک بدگمانی کوئی اور نہیں ہو سکتی، اس لیے ضرورت ہے کہ اس کو دُور کرنے کی کوشش کی جائے۔

سب سے پہلے اس مسئلہ پر غور کرنا چاہیے کہ قرآن مجید کا مقصدِ نزول کیا ہے؟

قرآن مجید میں آدم علیہ السلام اور شیطان کا قصہ متعدد سورتوں میں بیان کیا گیا ہے۔

اس قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب شیطان نے خدا کے حکم کے خلاف آدمؑ کو غرور اور حسد کی وجہ سے سجدہ کرنے سے انکار کردیا تو خدا نے شیطان کو حکم دیا:

قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ	فرمایا: پھر تو یہاں سے ـ یعنی جنت سے ـ
لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ	اتر، تجھے یہ حق نہیں ہے کہ تو اس میں گھمنڈ
اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ۝	کرے تو نکل، یقیناً تو ذلیلوں میں
(الاعراف ـ ۷ : ۱۳)	سے ہے۔

اس پر شیطان نے کچھ مہلت مانگی اور جوشِ حسد میں جھلا کر کہا:

قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ	بولا: چونکہ تو نے مجھے گمراہی میں ڈالا ہے
لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝	اس وجہ سے میں تیری سیدھی راہ پر ان
ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ	کے لیے گھات میں بیٹھوں گا، پھر میں ان
اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ	کے آگے، ان کے پیچھے، ان کے داہنے اور
اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ؕ	ان کے بائیں سے ان پر تاخت کروں گا
وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ۝	تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکر گزار نہ پائے گا۔
(الاعراف ـ ۷ : ۱۶ ـ ۱۷)	

بالآخر شیطان نے حضرت آدمؑ کو فتنہ میں ڈالنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے مہلت حاصل کرلی اور ان کو دھوکا دینے میں کامیاب ہوگیا۔ جس کا نتیجہ بالآخر یہ ہوا کہ دونوں کو جنت سے نکلنے کا حکم ہوا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ حکم دیا:

قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ	فرمایا: اترو، تم ایک دوسرے کے دشمن
عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ	ہو اور تمہارے لیے زمین میں ایک وقت
مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝	خاص تک ٹھہرنا اور کھانا بلسنا ہے
(الاعراف ـ ۷ : ۲۴)	

آدمؑ اور ان کی ذرّیت کے لیے یہ مرحلہ بہت کٹھن تھا۔ وہ دنیا میں شیطان کے ساتھ بھیجے جاتے ہیں جو ایک طرف جوشِ حسد اور جذبۂ انتقام سے اس قدر بھرا ہوا ہے کہ پہلے ہی دن الٹی میٹم دیتا ہے کہ میں ان کے آگے سے، پیچھے سے، دائیں سے، بائیں سے ان کی راہ ماروں گا اور ان میں اکثر کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا اور دوسری طرف اس قدر شاطر اور چالاک ہے کہ ایک ہی چکمے میں آدمی کے عزم و ثبات کے تمام تار و پود بکھیر دیتا ہے۔ ایسی حالت میں ضروری تھا کہ رحمتِ الٰہی آدمؑ کو کوئی ایسا ہتھیار بھی دیتی جو اس پُرفریب دشمن کے مقابلہ میں کام آتا اور ان کی ذرّیت اس کے بے پناہ حملوں سے محفوظ رہ سکتی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ اور ان کی ذرّیت کو اس کے مقابلہ کے لیے ایک ہتھیار عنایت فرمایا اور ان کو مندرجہ ذیل الفاظ میں تسلّی دی:

فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی	تو اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے
فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَاخَوْفٌ	کوئی ہدایت تو جو میری ہدایت کی پیروی
عَلَیْهِمْ وَلَاهُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝	کریں گے تو ان کے لیے نہ کوئی خوف
(البقرۃ - ۲ : ۳۸)	ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اسی وعدہ کا ذکر سورۃ اعراف میں بھی ہے:

یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ	اے بنی آدم! اگر تمہارے پاس تمہیں میں
مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ	سے رسول آئیں تم کو میری آیات سناتے
فَمَنِ اتَّقٰی وَاَصْلَحَ فَلَا	تو جو ڈرا اور جس نے اصلاح کر لی ان
خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَاهُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝	کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین
(الاعراف - ۷ : ۳۵)	ہوں گے۔

آدمؑ کو شیطان سے دنیا میں خوف اور قیامت میں غمگینی کا جو اندیشہ تھا اللہ تعالیٰ نے اس وعدہ کے ذریعہ سے اس کو دور کر دیا۔

اس وقت اس قصہ کے اسرار و رموز سے بحث نہیں کرنی ہے۔ صرف یہ دکھانا ہے کہ قرآن نے جو علم الانسان پیش کیا ہے اور انسانی ارتقاء کی جو تاریخ بیان کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی فطرت میں جہاں بہت سی خوبیاں ہیں وہاں اس میں ایک ایسا خلا بھی ہے کہ جب تک خدا کی طرف سے انبیاء علم قطعی لے کر نہ آئیں وہ شیطان کے فتنوں سے محفوظ نہیں رہ سکتا بلکہ ہر قدم پر اس کے لیے خطرہ ہے کہ وہ فطرت کے عہد سے ہٹ کر گمراہی کے راستوں پر پڑ جائے۔ اس لیے یہ ضروری ہوا کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں اولادِ آدم کی ہدایت کے لیے اپنے انبیاء بھیجے جو اس امتحان گاہ میں ان کو عہدِ فطرت کی یاد دہانی اور صراطِ مستقیم کی ہدایت کرتے رہیں۔

جو لوگ قرآن مجید سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ قرآن کی اصطلاح میں 'شیطان' کا مفہوم نہایت وسیع ہے۔ شیطان جس طرح جنات میں سے ہوتے ہیں اسی طرح انسانوں میں سے بھی ہوتے ہیں اور جس طرح وہ انسان کے اعمال و اخلاق کو بگاڑتے ہیں اسی طرح انسان کی عقل پر بھی حملہ کر کے اس کو ماؤف کر دیتے ہیں۔ سورۂ ناس میں ہے:

الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۙ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝	جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے، جنوں میں سے اور انسانوں میں سے۔

(الناس - ۱۱۴: ۵ - ۶)

سورۂ بقرہ میں ہے:

وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ	اور جب وہ ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں، ہم تو ایمان لائے ہوئے ہیں اور جب اپنے شیطانوں کی مجلسوں میں پہنچتے ہیں تو کہتے ہیں، ہم تو آپ لوگوں کے ساتھ ہیں۔

(البقرۃ - ۲: ۱۴)

پھر اس کی چالاکی اور گمراہ کرنے کے فن میں مہارت کا یہ حال بیان کیا گیا ہے:

إِنَّهُ يَرَاكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُ	وہ اور اس کا جتھہ تم کو وہاں سے تاڑتا
مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ط	ہے جہاں سے تم ان کو نہیں تاڑتے۔

(الاعراف - ۷ : ۲۷)

اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں گمراہی اور ضلالت جن بھیسوں اور جن شکلوں میں بھی آئے وہ شیطان ہی کی طرف سے آتی ہے اور جن و بشر میں سے جو شریر وجود بھی خدا کی صراطِ مستقیم سے بھٹکائے اور مخلوقِ خدا کی راہ مارے وہ شیطان ہے۔ شیطان کے بھیس ان گنت اور اس کے داؤ بے شمار ہیں۔ انسان کے اندر جتنی ظاہری اور باطنی قوتیں ودیعت ہیں، سب کی گھاٹیاں اس کو معلوم ہیں۔ وہ ہر دروازے سے گھستا اور ہر راستہ سے نکلتا ہے۔ وہ خون بن کر رگوں میں دوڑتا ہے، جذبات و شہوات کی صورت میں ہیجان میں آتا ہے، حسن بن کر لبھاتا ہے، عشق بن کر چٹکیاں لیتا ہے، امید و تمنّا کے سبز باغ دکھا کر اچھالتا ہے، پھر مایوسی کی کمند ڈال کر پچھاڑ دیتا ہے۔ اس کے پاس طرح طرح کے واعظانہ لطیفے اور حکیمانہ نکتے ہیں۔ وہ منطقیوں کی طرح صغریٰ وکبریٰ تراشتا ہے، فلسفیوں کی طرح سیاست اور فرمانروائی کے نکتے بیان کرتا ہے اور جب ان تدبیروں سے بھی بنی آدم کی مخالفت اور دشمنی کا جوش ٹھنڈا نہیں پڑتا تو کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مدعیِ نبوت بن کر نبوّت کرنے لگ جاتا ہے۔ ایسے ہوشیار دشمن کے فتنوں سے انسان کو بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کتاب دی جائے وہ اگر محض چند قوانین اور چند نصیحتوں کا سیدھا سادہ مجموعہ ہو تو غور کیجیے کہ ایسا معمولی ہتھیار اتنے خوفناک دشمن کے مقابلہ میں کیا کام دے سکتا ہے؟

یہ ایک ضمنی بات تھی۔ اصلی بات جو کہنی ہے وہ یہ ہے کہ اسی وعدے کے مطابق خدا نے بنی آدم کی رہبری اور ہدایت کے لیے انبیاء مبعوث فرمائے اور کتابیں نازل

کیں، یہاں تک کہ اس آخری رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھیجا جس کی نسبت اگلے صحیفوں میں پیشین گوئی کی گئی تھی کہ اس کی لائی ہوئی روشنی دنیا کے ساتھ ہمیشہ رہے گی۔

قرآن مجید میں اس رسول کی صفت سورۂ جمعہ میں یہ بیان کی گئی ہے :

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّنَ	اسی نے اٹھایا ہے امیوں میں ایک رسول
رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ	انہی میں سے جو ان کو اس کی آیتیں
اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ	پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا
الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ق	ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم
(الجمعة - ٦٢ : ٢)	دیتا ہے۔

یہ اس دعا کی قبولیت کا اعلان ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمائی تھی :

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا	اور اے ہمارے رب، تو ان میں انہی
مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ	میں سے ایک رسول مبعوث فرما جو ان
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ	کو تیری آیتیں سنائے اور ان کو کتاب
وَيُزَكِّيهِمْ ط	اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ
(البقرة - ٢ : ١٢٩)	کرے۔

اس آیت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی چار صفتیں بیان ہوئی ہیں :

۱۔ تلاوتِ آیات

۲۔ تزکیہ

۳۔ تعلیم کتاب

۴۔ تعلیم حکمت

اور چونکہ انہی صفات کا مجموعہ قرآن مجید ہے اس وجہ سے ضرورت ہے کہ ان کی تشریح کی جائے تاکہ قرآن مجید کی حقیقت واضح ہو۔

تلاوتِ آیات اور تزکیہ :

پہلی چیز تلاوتِ آیات ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا سنانا۔ آیت کا لفظ، قرآن مجید میں مختلف معانی کے لیے استعمال ہوا ہے جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ آیت مذکورہ بالا میں یہ لفظ دلیل اور حجت کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور اس سے مراد خاص طور پر قرآن مجید کا وہ حصہ ہے جو دلائل اور براہین پر مشتمل ہے۔ قرآن مجید کے لیے اس لفظ کے استعمال سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ وہ اپنی تعلیمات پر خود دلیل و حجت ہے، کسی خارجی دلیل کا محتاج نہیں ہے۔

جو لوگ قرآن مجید کی ترتیبِ نزول سے واقف ہیں ان سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ اوائلِ نبوت میں قرآن مجید کا جو حصہ نازل ہوا وہ دین کے ان کلیات سے متعلق ہے جو تمام دین کے لیے بمنزلہ اساس و بنیاد ہیں۔ جس طرح ایک عمارت اس وقت تک تعمیر نہیں ہوسکتی جب تک اس کی بنیاد استوار نہ ہو اسی طرح دین کا قیام بھی اس وقت تک ناممکن ہے جب تک اس کے کلیات اچھی طرح ذہنوں میں راسخ نہ ہوں۔ اسلام کا پورا نظام تین محکم بنیادوں پر قائم ہے، توحید، معاد اور رسالت اور ان تینوں کی بنیاد فطرت اور آفاق کی نہایت مضبوط دلیلوں پر قائم ہے۔ قرآن مجید نے سب سے پہلے ان بنیادوں کو استوار کیا۔ ان کی استواری سے وہ غلط نقوش خود بخود مٹ گئے جو شرک، انکارِ معاد اور انکارِ نبوت کی وجہ سے قائم ہوگئے تھے۔ ان بنیادوں کو قرآن نے کس طرح قائم کیا اور ان غلط عقائد کو کن دلائل سے باطل کیا، اس سوال کا جواب محتاجِ تفصیل ہے۔ اس کے لیے ہماری کتاب، حقیقت شرک و توحید پڑھنی چاہیے۔

یہاں ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس موقع پر آیات سے قرآن مجید کا وہ حصہ مراد ہے جو اسلام کی بنیادی تعلیمات کے دلائل و براہین پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں قرآن مجید کا جو

حصّہ نازل ہوا وہ فقہی احکامات سے بالکل خالی ہے۔ اس میں صرف مذہب کے ان بنیادی اور اساسی مسائل سے بحث ہے جو دین کے پورے نظام کے لیے شیرازہ کی حیثیت رکھتے ہیں، اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عقلاً ایسا ہی ہونا چاہیے تھا، کیونکہ کوئی تعلیم بغیر بنیاد و اساس کے قائم نہیں رہ سکتی۔ جب آپ کوئی عمارت بناتے ہیں تو بام و در سے نہیں شروع کرتے بلکہ پہلے بنیاد کو محکم کرتے ہیں۔ یہی حال مذہب کا ہے۔ اس کی تمام جزئیات چند کلیات کے ماتحت ہیں اور جب تک یہ کلیات مستحکم نہ ہوں اس وقت تک جزئیات اور شاخوں کا وجود میں آکر قائم رہنا ناممکن ہے۔

ان کلیات کی بنیاد انسان کی فطرت کے باطن میں موجود ہوتی ہے اس وجہ سے فطرت اگر اوہام وخرافات کے گرد وغبار سے اٹ نہیں گئی ہے تو آفتابِ نبوت کی پہلی ہی کرنوں سے چمک اٹھتی ہے:

یَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ط	اس کا روغن اتنا شفاف ہو کہ گویا آگ کے چھوئے بغیر ہی بھڑک اٹھے گا۔

(النور - ۲۴ : ۳۵)

در دل ہر کس کہ از دانش مزہ است
روی و آوازِ پیمبر معجزہ است

لیکن اگر فطرت فاسد خیالات اور باطل عقائد کی آلودگیوں سے نجس ہوگئی ہے تو اس کو صاف کرنا پڑے گا۔ جب تک یہ اچھی طرح صاف نہ ہولے، کسی عمدہ تعلیم کو یہ قبول نہیں کرسکتی۔ جس طرح ایک مریضِ معدہ صالح سے صالح غذا ہضم نہیں کرسکتا اس وجہ سے ضروری ہوتا ہے کہ پہلے اس کے امراض کی تشخیص کی جائے، اس کو دوائیں پلائی جائیں اور جب وہ بالکل تندرست ہوجائے تب اس کو غذا دی جائے۔ بغیر اس کے اگر غذا دے دی گئی تو طبیعت قبول نہیں کرے گی۔ سورہ انعام میں ایسے ہی

آلودہ فطرت انسانوں کی تصویر کھینچی گئی ہے :

وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ	اور اللہ جس کو گمراہ کرنا چاہتا ہے اس
صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا	کے سینہ کو بالکل تنگ کر دیتا ہے۔ گویا
يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ ؕ كَذٰلِكَ	اسے آسمان میں چڑھنا پڑ رہا ہے۔ اسی
يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى	طرح اللہ ناپاکی مسلط کر دیتا ہے ان
الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝	لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے۔

(الانعام - ۶ : ۱۲۵)

پس تلاوتِ آیات کے بعد مذکورہ بالا آیت میں تزکیہ کا ذکر آیا ہے تو یہ درحقیقت نتیجہ ہے۔ تلاوتِ آیات کا۔ اللہ کی آیات کی تلاوت سے انسان کے دل سے باطل خیالات و عقائد کی جڑیں جب کٹ جاتی ہیں تو اس کے دل کی زمین صحیح خیالات و عقائد کی تخم ریزی کے لیے بالکل پاک و صاف ہو جاتی ہے۔

یہ بات اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ خدا نے فطرت میں خیر و شر کی تمیز ودیعت کی ہے جس طرح انسان حواسِ خمسہ کی مدد سے خوبصورت اور بدصورت میں امتیاز کرتا ہے، سیاہ اور سفید کو پہچانتا ہے، خوشبو اور بدبو میں فرق کرتا ہے، اسی طرح اس کی فطرت کے باطن میں ایک روشنی موجود ہے جو نیک و بد کے امتیاز میں اس کی رہبری کرتی ہے۔

سورۃ قیامہ میں ہے :

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ	بلکہ انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے۔

(القیمۃ - ۷۵ : ۱۴)

دوسری جگہ ہے :

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝	پس اس کو سمجھ دی اس کی بدی اور نیکی کی۔

(الشمس - ۹۱ : ۸)

ایک اور مقام پر فرمایا ہے :

اِنَّا ھَدَیْنٰہُ السَّبِیْلَ ہم نے اس کو راہ سجھا دی۔

(الدھر - ۷۶ : ۳)

جن لوگوں میں یہ روشنی، شہوات کی پیروی اور محبت دنیا کی وجہ سے گل ہو جاتی ہے وہ روحانی اعتبار سے بالکل مردہ ہو جاتے ہیں۔ پیغمبر اپنی تعلیم کی تیز شعاعیں کتنی ہی قوت اور شدت کے ساتھ ان پر ڈالے ان میں کوئی حرکت اور حرارت نمودار نہیں ہوتی۔

ایسے ہی لوگوں کی بابت فرمایا ہے:

اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِیْنَ ○

تم مُردوں کو نہیں سُنا سکتے اور نہ بہروں کو اپنی پکار سنا سکتے جب کہ وہ پیٹھ پھیر کر بھاگے جا رہے ہوں۔

(النمل - ۲۷ : ۸)

اِنَّمَا یَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ یَسْمَعُوْنَ ؕ وَالْمَوْتٰی یَبْعَثُھُمُ اللّٰہُ ثُمَّ اِلَیْہِ یُرْجَعُوْنَ ○

بات تو وہی مانیں گے جو سنتے سمجھتے ہیں، رہے یہ مُردے تو اللہ ان کو اٹھائے گا پھر یہ اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

(الانعام - ۶ : ۳۶)

سورۂ بقرہ کے شروع میں جن لوگوں کے دلوں پر مہر کرنے کا ذکر ہے وہ اسی طرح کے لوگ ہیں۔

لیکن جن دلوں کے اندر یہ روشنی موجود ہوتی ہے خواہ وہ کتنی ہی دھندلی اور کمزور کیوں نہ ہو، پیغمبر تلاوتِ آیات کے ذریعے سے ان کو روشن تر کر دیتا ہے۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ پیغمبر ہمارا تزکیہ ہماری فطرت کے مطابق کرتا ہے۔ ہماری فطرت کے اندر نیکی و بدی کی پہچان کے جو بنیادی اصول موجود ہیں وہ پہلے ان کو پاک وصاف کر کے نمایاں کرتا ہے اور پھر انھی پر اپنی تمام تعلیمات کی عمارت

تعبیر کرتا ہے۔

لیکن تزکیہ کے متعلق یہ امر ملحوظ رہے کہ یہ کوئی مفرد اور سادہ عمل نہیں ہے، بلکہ یہ کئی جزؤں سے مرکّب ہے۔ اس کا موضوع نفس انسانی ہے جو علم اور عمل دو چیزوں کا مجموعہ ہے۔ اس لیے تزکیہ کے بھی دو پہلو ہیں: تزکیۂ علم اور تزکیۂ عمل۔ اس اعتبار سے تزکیہ انسان کے تمام اعمال اور تمام عقائد پر حاوی ہو جاتا ہے اور چونکہ انسان کے تمام اعمال کا سرچشمہ عقائد ہی ہیں اس لیے پیغمبر اپنی تعلیمات سے سب سے پہلے عقائد، یعنی لوگوں کے علم و ادراک کا تزکیہ کرتا ہے۔

تزکیۂ علم کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا علم تمام کثافتوں اور آلودگیوں سے اس قدر صاف اور مجلّٰی ہو جائے کہ وہ فکر و نظر کے تمام گوشوں میں لغزشوں سے محفوظ رہ سکے اور اگر کبھی نفس و شیطان کی فتنہ انگیزیوں سے اس پر غبار آجائے تو معمولی توجہ سے صاف ہو جائے۔ اور تزکیۂ عمل کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کے تمام نشیب و فراز میں انسان کا کوئی قدم خواہشوں کی رہنمائی میں نہ اٹھے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے منشا کے مطابق اٹھے اور اگر نفس کی شرارت یا جذبات کے غلبہ کی وجہ سے کوئی قدم غلط اٹھ جائے تو تنبیہ ہوتے ہی اس غلط اٹھائے ہوئے قدم کو واپس لے اور توبہ و ندامت سے اس کی تلافی کرے۔ سورۂ اعراف میں ایسے ہی لوگوں کی تعریف میں کہا گیا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ	جو لوگ خدا ترس ہیں جب ان کو کوئی
طَائِفٌ مِنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا	شیطانی چھوت لاحق ہونے لگتی ہے وہ
فَإِذَا هُمْ مُبْصِرُونَ ○	خدا کا دھیان کرتے ہیں اور دفعتہً ان کے
(الاعراف - ۷ : ۲۰۱)	دل روشن ہو جاتے ہیں۔

اب آئیے صرف تزکیۂ علم ہی کے معاملہ کو لے کر اس پر غور کیجیے کہ تنہا اسی چیز کے کتنے پہلو ہو سکتے ہیں۔ ایک کسان جو کھیت میں ہل چلاتا ہے وہ بھی فکر و نظر کرتا ہے۔

اور ایک حکیم، جو اسرارِ کائنات کی گتھیاں سلجھاتا ہے وہ بھی فکر و نظر کرتا ہے لیکن دونوں کے فکر و نظر میں کتنا فرق ہے! ایک کسان کے فکر و نظر کی جو آخری حد ہے۔ ایک حکیم کے فکر و نظر کا پہلا قدم بھی اس سے منزلوں آگے پڑتا ہے اور ایک حکیم کے فکر و نظر کے جو مبادی ہیں وہ عامیوں کے تمام علم و ادراک کی سِدرۃُ المنتہیٰ سے بھی پرے ہیں ؎

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

اسی طرح ان میں سے ایک کے شبہات و شکوک محض تقلیدی ہوتے ہیں جو حق کی ایک ضرب کی بھی تاب نہیں لاسکتے اور بڑی آسانی سے پارہ پارہ ہوجاتے ہیں اور دوسرے کی گمراہیاں اپنی تائید میں منطق و فلسفہ کے بہت سے دلائل فراہم کرلیتی ہیں جن کو شکست دینے کے لیے نہایت طاقتور دلیلوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس وجہ سے قرآن، اگر نوعِ انسانی کے تمام طبقات کے تزکیۂ علم و عمل کے لیے آیا ہے تو ضروری ہے کہ اس کے دلائل و براہین دونوں کے لیے تشفی بخش ہوں۔ پہلے کو جو کچھ دے اس کا معیار اس کی استعداد اور اس کی عقل سے بلند نہ ہو اور اس کی جن غلطیوں کی اصلاح کرے، اس کے لیے ایسے سادہ اور دل نشین دلائل استعمال کرے کہ ان کی دل پذیری کو گرویدہ کرلے۔ اسی طرح دوسرے کو جو کچھ سکھلائے، اس کا معیار اتنا بلند ہو کہ اس کے دل کو طمانیت اور اس کی روح کو تسلی حاصل ہو اور جو کچھ اس سے چھینے ان کو ایسے اٹل اور محکم دلائلِ حکمت سے چھینے کہ منطق و فلسفہ کی کوئی قوت بھی اس کو بچا نہ سکے۔

اس معاملہ کا ایک اور پہلو بھی قابلِ غور ہے۔ وہ یہ کہ انبیائے کرام کے متعلق معلوم ہے کہ وہ نبوت سے پہلے بھی کمالِ عقل و ادراک سے سرفراز ہوتے ہیں۔ وہ اپنی پاکیزہ فطرت کی روشنی میں علم و عمل کی وہ منزلیں طے کرلیتے ہیں جن کو دوسرے وحی و الہام کی رہبری میں بھی نہیں طے کرسکتے۔ لیکن علم و عمل کا یہ مقام حاصل کرلینے کے باوجود ان کی تشنگی

اور حیرانی بدستور باقی ہی رہتی ہے اور جب تک وحی کی رحمت نازل نہیں ہوتی ان کی یہ تشنگی رفع نہیں ہوتی۔ وہ اپنی حیرانی کو دور کرنے اور اپنے سینہ کے منوّر ہونے کے لیے برابر وحیٔ الٰہی کی تجلیّات کے منتظر رہتے ہیں اور یہ روشنی ان کو اس قدر محبوب ہوتی ہے کہ اس کی زیادتی کے لیے اللہ تعالیٰ سے والہانہ دعائیں کرتے ہیں :

رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ٥	اے میرے رب ! میرے علم میں افزونی
(طٰہٰ ۔ ۲۰ : ۱۱۴)	فرما۔

اور جب یہ حاصل ہو جاتی ہے تو اس کو پاکر تمام مادی تائیدات سے بے نیاز اور تمام دنیاوی مخالفتوں سے بے خوف اور نڈر ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ سورۂ حجر میں مخالفینِ اسلام کی سرگرمیوں اور شرارتوں کے ذکر کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ان الفاظ میں تسلّی دی گئی ہے :

فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِیْلَ ٥ اِنَّ	تو ان سے خوب صورتی کے ساتھ درگزر
رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ ٥	کرو، تمہارا رب بڑا ہی پیدا کرنے والا
وَلَقَدْ اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ	اور علم والا ہے۔ اور ہم نے تم کو سات
الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ ٥	مثانی اور قرآنِ عظیم عطا کیے۔ ہم نے اُن
لَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا	کے مختلف گروہوں کو جن چیزوں سے
بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ	بہرہ مند کر رکھا ہے ان کی طرف آنکھ اٹھا
عَلَیْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ	کر بھی نہ دیکھو اور نہ ان کی حالت پر غم کرو
لِلْمُؤْمِنِیْنَ ٥	اور اپنی شفقت کے بازو اہلِ ایمان پر
(الحجر ۔ ۱۵، ۸۵ ۔ ۸۸)	جھکائے رکھو۔

یہ آیت اس حقیقت کی ایک نہایت واضح شہادت ہے کہ قرآن مجید اور اس کی آیات کے اندر جو قوت چھپی ہوئی ہے وہ دنیا کے سروسامان اور اس کی فوجوں اور

اس کے لشکروں کے اندر نہیں ہے۔ استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی علیہ الرحمۃ مذکورہ بالا آیات کے اسرار پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

انك تنصر بهذا الجند الروحاني باكثر مما ترجو من اولي القوة والشوكة۔ فاصبر على صلوٰتك و قراءة المثاني واستعن بالمصلين معك و اعرض عن المشركين المتولين عنك۔

اللہ تعالیٰ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے کہ اس روحانی فوج کے ذریعہ تم کو اس سے زیادہ مدد و نصرت حاصل ہوگی جتنی قوت و شوکت والوں سے توقع ہے پس نماز اور قراءۃِ مثانی پر ثابت قدم رہو اور جو نمازی مسلمان تمہارے ساتھ ہیں ان کو لے کر مشرکین اور اعراض کرنے والوں سے بے نیاز ہو جاؤ۔

اس سے معلوم ہوا کہ خود پیغمبر جس کی فطرت علم و عمل کی مافوق العادۃ قوتوں اور قابلیتوں کا خزانہ ہوتی ہے، اپنے تزکیہ کے لیے ان آیات کا محتاج ہوتا ہے۔ ان کی رہنمائی سے وہ راہ یاب ہوتا ہے۔ ان کی روشنی اس کے سینہ کو کھولتی اور اس کے دل کو منور کرتی ہے۔ ان کے عشق میں وہ بے تابانہ 'رَبِّ زِدْنِي عِلْماً' کا وظیفہ پڑھتا ہے اور ان کو پاتے وقت اس کی بے قراری، اس کی بے خودی اور اس کے شوق اور عجلت کا یہ حال ہوتا ہے کہ معلّمِ غیب کی زبان سے اس کو لَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ (القیامۃ) کا محبت آمیز عتاب سننا پڑتا ہے۔

جس قرآن عظیم کی آیات کا یہ رتبہ ہو اس کی نسبت یہ بدگمانی کر لینا کہ وہ محض چند قوانین اور وعظوں اور چند قصوں کا ایک منتشر مجموعہ ہے، جس کو سمجھنے کے لیے نہ تفکّر و تدبّر کی ضرورت ہے اور نہ دوسرے وسائل و اسباب سے کسی قسم کی مدد حاصل کرنے کی، کس قدر افسوسناک غلط فہمی ہے!

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ پیغمبر پہلے تلاوتِ آیات کے ذریعہ نفوس کا تزکیہ کرتا

کرتا ہے، فطرت کے مدفون خزانوں کو ابھارتا ہے، اُٹے ہوئے چشموں کو جاری کرتا ہے، دبی ہوئی صلاحیتوں کو نمایاں کرتا ہے اور چونکہ فسادِ علم کی جڑ شرک اور فسادِ عمل کی جڑ انکارِ معاد ہے اس لیے سب سے پہلے توحید و معاد کی تعلیم کو دلوں میں راسخ کرتا ہے اور جب ان سے فارغ ہو چکتا ہے، تعلیمِ کتاب کا باب شروع کرتا ہے۔

تعلیمِ کتاب:

تعلیمِ کتاب میں کتاب سے کیا مراد ہے؟ ظاہر ہے کہ قرآن مجید، لیکن آیات کا حصہ اوپر مذکور ہو چکا ہے اور حکمت کا ذکر مستقلاً علیحدہ آ رہا ہے اس وجہ سے اس سے کل قرآن مراد نہیں ہو سکتا، اس کا صرف وہ حصہ ہو سکتا ہے جو احکام و قوانین سے متعلق ہے۔ اس تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ لفظ آیت کی طرح لفظ کتاب بھی قرآن مجید میں کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے جن میں سے بعض مشہور معانی یہ ہیں:

۱۔ کتابِ آسمانی جو انبیاء پر نازل ہوئی، مثلاً: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ (البقرۃ - ۲: ۲) (یہ کتابِ الٰہی ہے۔ اس کے کتابِ الٰہی ہونے میں کوئی شک نہیں)۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کا قرارداده فیصلہ اور اجلِ معیّن، مثلاً: وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ (الحجر - ۱۵: ۴) (اور ہم نے جس قوم کو بھی ہلاک کیا ہے اس کے لیے ایک معیّن نوشتہ رہا ہے)۔

۳۔ شرائع و قوانین، مثلاً: لَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ۭ (البقرۃ - ۲: ۲۳۵) (اور عقدِ نکاح کا عزم اس وقت تک نہ کرو جب تک قانون اپنی مدت کو نہ پہنچ جائے)۔

۴۔ اللہ تعالیٰ کے قرارداده فیصلوں کا دفتر، مثلاً: وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (الانعام - ۶: ۵۹) (اور نہ کوئی تر اور خشک چیز ہے مگر وہ ایک روشن کتاب میں مندرج ہے)۔

۵۔ اعمال نامے، مثلاً: فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ (الحاقة۔ ۶۹: ۱۹) (جس کو دیا جائے گا اس کا اعمال نامہ اس کے دہنے ہاتھ میں)۔

آیتِ زیرِبحث میں ہمارا خیال ہے، کتاب کا لفظ احکام و قوانین کے لیے آیا ہے۔ قرآن مجید میں اس معنی کے لیے اس لفظ کا استعمال مشہور ہے۔ چنانچہ سورۂ بقرہ میں جہاں سے احکام و قوانین کا باب شروع ہوتا ہے، اکثر احکام 'کُتِبَ' یا 'کُتِبَ' کے لفظ سے بیان ہوئے ہیں: 'کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی' (البقرة۔ ۲: ۱۷۸)؛ 'کُتِبَ عَلَیْکُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ' (البقرة۔ ۲: ۱۸۰)؛ 'کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ' (البقرة۔ ۲: ۱۸۳)؛ 'کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ' (البقرة۔ ۲: ۲۱۶) وغیرہ۔ پھر متعدد جگہ صریح طور پر کتاب سے قانونِ مشروع کو مراد لیا ہے، مثلاً: وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّکَاحِ حَتّٰی یَبْلُغَ الْکِتٰبُ اَجَلَهٗ' (البقرة۔ ۲: ۲۳۵) (اور عقدِ نکاح کا عزم اس وقت تک نہ کرو جب تک قانون اپنی مدت کو نہ پہنچ جائے)۔ اس آیت میں کتاب سے مراد قانونِ عدت ہے۔ سورۂ احزاب میں ہے: 'وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِیْ کِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُهٰجِرِیْنَ' (الاحزاب۔ ۳۳: ۶) (اور رحمی رشتے رکھنے والے آپس میں، دوسرے مومنین و مہاجرین کے مقابل اولیٰ ہیں، اللہ کے قانون میں)۔ اس آیت میں کتاب سے قانونِ وراثت مراد ہے۔

الغرض کتاب کا لفظ قرآن مجید میں شرائع اور قوانین کے لیے معروف ہے اور چونکہ آیت زیرِبحث میں قرآن مجید کے اجزائے ترکیبی کی تحلیل کر کے بتایا گیا ہے کہ اس میں کیا کیا عناصر ہیں۔ اس وجہ سے موقع و محل کا تقاضا اور قرینہ کی شہادت یہی ہے کہ یہاں کتاب سے شرائع و قوانین کا حصہ مراد لیا جائے۔

اس تفصیل سے تعلیمِ الٰہی کی حکمت روشن ہوتی ہے کہ اس نے ہماری فطرت

کے تقاضوں کو کس قدر ملحوظ رکھا ہے کہ جب تک دلائل کے ذریعہ سے ہم کو تمام غیر فطری آلودگیوں سے پاک نہ کر لیا اس وقت تک قوانین کی اطاعت کی ذمہ داری ہم پر نہیں ڈالی۔

فطرت کی مثال معدہ کی ہے جس طرح معدہ خراب غذاؤں کے استعمال اور فضلات کے جمع ہو جانے سے اپنی اشتہا کھو بیٹھتا ہے اور پھر کسی لذیذ سے لذیذ غذا کے لیے بھی اپنے اندر کوئی رغبت نہیں پاتا اسی طرح فطرت بھی اوہام و خرافات کے غلبہ سے اپنی خواہش ارتقا کھو بیٹھتی ہے اور پھر کسی عملِ صالح کے لیے بھی مستعد نہیں ہوتی۔ ایسی حالت میں ضروری ہوتا ہے کہ جس طرح طبیبِ جسمانی پہلے معدہ کو خراب فضلات سے پاک کر کے اس کی اشتہاء کو اصلی حالت پر لانے کی کوشش کرتا ہے اسی طرح طبیبِ روحانی بھی پہلے فطرت کو اس کی آلودگیوں سے صاف کر کے اس کی اصلی بھوک کو مشتعل کرے۔ اس کے مشتعل ہو جانے کے بعد شریعت اور دین کی ہر بات کے لیے وہ اسی طرح بے تاب اور مضطرب ہو گی جس طرح ایک پیاسا پانی کے لیے اور ایک بھوکا غذا کے لیے بیتاب ہوتا ہے۔
قرآن مجید نے اس حالت کی تصویر یوں کھینچی ہے:

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِیْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۝ (آل عمران - ۳: ۱۹۳)	اے ہمارے رب، ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا ایمان کی دعوت دیتے کہ لوگو، اپنے رب پر ایمان لاؤ، تو ہم ایمان لائے۔ اے ہمارے رب، ہمارے گناہوں کو بخش دے، ہماری برائیوں کو ہم سے دور کر دے اور ہمیں موت اپنے وفادار بندوں کے ساتھ دے۔

اس تفصیل سے دو اہم باتیں سامنے آتی ہیں:

۱۔ تمام شریعت کا سرچشمہ فطرت کے چند بنیادی حقائق ہیں۔ جس طرح ایک سے سو اور ہزار وجود میں آتے ہیں اسی طرح چند بنیادی حقائق کے لوازم و نتائج کے طور پر دین کا سارا عملی و اعتقادی نظام وجود میں آتا ہے اسی وجہ سے اسلام کو دینِ فطرت کہا گیا ہے:

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (الروم ۔ ۳۰ : ۳۰)	اُس دین فطرت کی پیروی کرو جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا۔ اللہ کی بنائی ہوئی فطرت کو تبدیل کرنا جائز نہیں ہے۔ یہی سیدھا دین ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔
اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ فِیْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ (العنکبوت ۔ ۲۹ : ۴۹)	کھلی ہوئی دلیلیں ان لوگوں کے سینوں میں جن کو علم عطا ہوا۔

فطرت کے یقینیات اور اسلام کے عملی نظام میں یہ لزوم اس قدر نمایاں ہے کہ جس طرح اقلیدس کے اصولِ موضوعہ کے بعد ان کے نتائج سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح ان یقینیات کو تسلیم کرنے کے بعد مذہب کی تعلیمات سے انکار ناممکن ہے۔ ایسے ہی مسلمات اور یقینیات سے جب قرآن مجید نتائج نکالتا ہے اور ان کو لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے اور لوگ ان کو نہیں مانتے تو کہا جاتا ہے:

'كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ' (الصّٰفّٰت ۔ ۳۷ : ۱۵۴)؛ 'فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ' (فاطر ۔ ۳۵ : ۳)

کیسا فیصلہ کرتے ہو؟ کہاں بھٹکے جا رہے ہو؟

۲۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ شرائع و احکام حقیقت میں تزکیہ کے جزئیات ہیں۔ یہ تزکیہ کو کامل اور روشن کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت سے ایمان پیدا ہوتا ہے اور عمل کے ذریعہ سے بندہ اس ایمان کو

بڑھاتا ہے۔ یہ فطرت کا عام قانون ہے کہ علم، عمل ہی کے ذریعہ سے پختہ اور راسخ ہوتا ہے۔ ایک کسان سے لے کر ایک سائنس دان تک سب عمل ہی کے ذریعہ سے اپنے علم کو فروغ دیتے ہیں۔ دین کی سیرِ باطن میں بھی فطرت کا یہی قانون جاری ہے۔

پس شرائع کا اصلی مقصد تزکیہ اور ایمان و تقویٰ کی روشنی کو بڑھانا ہے۔ چنانچہ نماز کی نسبت فرمایا ہے کہ: اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ (العنکبوت - ۲۹ : ۴۵) (نماز بے حیائی اور منکر سے روکتی ہے)۔ زکوٰۃ کے متعلق فرمایا ہے: یُؤْتِیْ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی (الیل - ۹۲ : ۱۸) (وہ اپنا مال پاکیزگی حاصل کرنے کے لیے دیتا ہے)۔ روزہ کی بابت فرمایا ہے: لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ (البقرۃ - ۲ : ۱۸۳) (تاکہ تم تقویٰ اور پرہیزگاری حاصل کرو)۔ اور قربانی کی نسبت فرمایا ہے: لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَا دِمَآؤُھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ (الحج - ۲۲ : ۳۷) (اور اللہ کو نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے نہ ان کا خون، بلکہ اس کو صرف تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے)۔ اگر شرائع اور قوانین اس مقصد سے محروم ہو جائیں، یعنی ان سے تزکیہ اور تقویٰ نہ حاصل ہو سکے اور ایمان کی روشنی نہ بڑھے تو پھر یہ بالکل بے سود ہو جاتے ہیں۔ ایسی نماز اور ایسے روزے اور ایسے حج کی اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی قدر نہیں ہے ؎

علم گر بر تن زنی مارے بود
علم گر بر دل زنی یارے بود

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں احکام و قوانین کا بیان اس طرح نہیں ہوتا جس طرح فقہ و قانون کی عام کتابوں میں ہوتا ہے۔ قرآن ہر حکم کے آگے پیچھے خدا کی صفتوں اور آخرت کی بار بار یاد دہانی کراتا ہے اور اس کے روحانی و اخلاقی نتائج اور اجتماعی و تمدّنی فوائد ایسے دل نشیں انداز میں پیش کیے جاتے ہیں کہ دل پر ان احکام کا اثر

پڑتا ہے۔ فقہ کی کوئی کتاب پڑھیے تو قلب پر کوئی اثر طاری نہ ہوگا، لیکن انہی باتوں کو اگر قرآن مجید میں تدبّر کے ساتھ پڑھیے تو روح کا گوشہ گوشہ ان کی عظمت کے احساس اور ان کی تعمیل کے جذبہ سے معمور ہو جائے گا۔ جو بات قانون کی کتابوں میں ایک شاخِ بریدہ نظر آتی ہے وہی بات قرآن مجید میں ایک سروِ رعنا کی طرح نظر آئے گی۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ ہر شخص جس نے قرآن کا تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ قرآن فقہی احکام کو ہمیشہ دین کی اصولی تعلیمات کے ساتھ ملا کر بیان کرتا ہے۔ وہ کبھی تو فروع سے اصول کی طرف بڑھتا ہے جس کی مثال سورۂ احزاب وغیرہ میں ملتی ہے، کبھی اصول سے فروع کی طرف اترتا ہے جس کی مثال سورۂ جمعہ میں موجود ہے اور کبھی اصول کو اجزاء و فروع کے درمیان ایک آفتاب تاباں کی طرح رکھ دیتا ہے، جس کی بہترین مثال سورۂ نور میں موجود ہے۔

تعلیمِ حکمت:

تیسری چیز تعلیمِ حکمت ہے۔ حکمت کے متعلق ایک نہایت ہی اہم سوال یہ ہے کہ حکمت قرآن ہی کا ایک جزو ہے یا اس سے علیحدہ کوئی چیز ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ کتابِ الٰہی جس طرح آیات اللہ اور احکام پر مشتمل ہے اسی طرح حکمت پر بھی مشتمل ہے۔ لیکن ہمارا یہ دعویٰ ان لوگوں کے خیال کے خلاف پڑے گا جو حکمت سے حدیث یا بعض دوسرے علوم مراد لیتے ہیں اور چونکہ یہ مذہب بعض اکابر امت، مثلاً امام شافعیؒ وغیرہ کا بھی ہے اس وجہ سے اس کو نظر انداز کرنا مشکل ہے لہٰذا دیکھنا چاہیے کہ جو لوگ حکمت سے حدیث مراد لیتے ہیں ان کی دلیل کیا ہے؟

ان کی دلیل یہ ہے کہ حکمت کا لفظ مندرجہ صدر آیت میں کتاب کے لفظ کے ساتھ آیا ہے۔ کتاب سے یہ لوگ قرآن مجید، باعتبار مجموعی، مراد لیتے ہیں۔ اس لیے

ضروری ہوا کہ حکمت سے کوئی اور چیز مراد لیں اور قرآن کے بعد ظاہر ہے کہ حدیث کے سوا کوئی دوسری چیز اس لفظ کا مدلول نہیں بن سکتی۔

لیکن اوپر کے مباحث سے یہ بات صاف ہو گئی ہے کہ یہ استدلال کچھ مضبوط نہیں ہے۔ آیت مذکورہ میں جیسا کہ ہم نے تشریح کی ہے، کتاب سے مراد احکام و قوانین ہیں اس لیے حکمت کے لیے خود قرآن میں کافی گنجائش ہے۔ اس سے حدیث یا قرآن سے خارج کسی اور شے کو مراد لینا کچھ ضروری نہیں ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ حدیث میں بھی حکمت ہے۔ حدیث کا رتبہ بہت بلند ہے۔ وہ امت کے لیے قرآن کے بعد دوسری چیز ہے اس میں خود حکمت قرآن کا بھی ایک بڑا ذخیرہ ہے۔ پھر اگر حدیث میں حکمت نہ ہوگی، تو کہاں ہوگی؟ لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے کہ اس آیت میں حکمت سے مراد حدیث ہے۔ مختلف وجوہ اور قرائن اس کے خلاف ہیں۔ ان میں سے بعض کی طرف ہم یہاں اشارہ کرتے ہیں۔

۱۔ متعدد آیات میں حکمت کے لیے 'یُتلیٰ'، 'اُنزِلَ' اور 'اُوحِیَ' کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جن کا استعمال حدیث کے لیے قرآن میں کہیں نہیں ہوا ہے، مثلاً:

وَاَنْزَلَ اللّٰہُ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَعَلَّمَکَ مَالَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ ط (النسآء - ۴ : ۱۱۳)	اور اللہ نے تم پر کتاب و حکمت نازل فرمائی اور تمہیں وہ چیز سکھائی جو تم نہیں جانتے تھے۔

دوسری جگہ ہے:

وَاذْکُرْنَ مَایُتْلٰی فِیْ بُیُوْتِکُنَّ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰہِ وَالْحِکْمَۃِ ط (الاحزاب - ۳۳ : ۳۴)	تمہارے گھروں میں اللہ کی آیات اور حکمت کی جو تعلیم ہوتی ہے اس کا چرچا کرو۔

ایک اور مقام پر دین کی اصولی باتوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ (بنی اسرآءیل - ۱۷ : ۳۹)	یہ ان باتوں میں سے ہیں جو تمہارے رب نے حکمت میں سے تمہاری طرف وحی کی ہیں۔

۲۔ مختلف مواقع پر قرآن مجید کے دلائل و براہین کو حکمتِ بالغہ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور خود قرآن کو قرآن حکیم اور کتاب حکیم وغیرہ کہا گیا ہے، مثلاً: حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ (القمر - ۵۴ : ۵) (نہایت دل نشین حکمت) اور' وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ' (یٰس - ۳۶ : ۲) (شاہد ہے پُر حکمت قرآن)۔

حضرت عیسٰی علیہ السلام کے متعلق فرمایا گیا ہے:

وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۚ (المآئدۃ - ۵ : ۱۱۰)	یاد کرو جب کہ میں نے تمہیں کتاب، حکمت اور تورات و انجیل کی تعلیم دی۔

اس آیت میں کتاب اور حکمت کے الفاظ کے بعد تورات و انجیل کے الفاظ بطور تشریح آئے ہیں۔ لفظ کتاب کی تشریح تورات ہے اور حکمت کی تشریح انجیل کے لفظ سے کی گئی ہے۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ تورات زیادہ تر احکام و قوانین پر مشتمل ہے اور انجیل دلائل و نصائح کا ایک مجموعہ ہے۔ مقدم الذکر میں دلائل و نصائح کا حصہ بہت کم ہے اور موخر الذکر میں احکام و شرائع برائے نام ہیں۔ احکام و قوانین کے بارہ میں انجیل، تورات کی تصدیق کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتی ہے۔ تورات کی اسی قانونی اہمیت کی وجہ سے اس کو کتاب کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور انجیل کو اس کی حکمتوں اور نصیحتوں کی وجہ سے حکمت کہا گیا۔

بعض دوسری آیات سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے:

وَلَمَّا جَآءَ عِيْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ	اور جب عیسٰی کھلی نشانیوں کے ساتھ
قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ	آیا تو اس نے دعوت دی کہ میں تمہارے
وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِىْ	پاس حکمت لے کر آیا ہوں اور تاکہ میں
تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ ؕ	تم پر واضح کردوں بعض وہ باتیں جن
(الزخرف - ۴۳ : ۶۳)	میں تم نے اختلاف کیا ہے۔

ان وجوہ کی بنا پر حکمت سے صرف حدیث کو مراد لینا ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے، بلکہ حدیث حکمت میں شامل ہے۔ یہ غلط فہمی کتاب اور حکمت، دونوں لفظوں کے اکٹھے ہوجانے کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی، لیکن ہم نے جو پہلو واضح کیے ہیں ان کی روشنی میں دونوں کے حدود الگ الگ ہوجاتے، جس کے بعد یہ غلط فہمی باقی نہیں رہتی۔

لفظِ حکمت کی لغوی تحقیق:

اب اجمالاً لفظِ حکمت کو لغت اور اس کے استعمالات کی روشنی میں بھی دیکھ لینا چاہیے۔ مولانا حمید الدین فراہیؒ نے 'مفردات القرآن' میں اس لفظ پر مفصل بحث کی ہے۔ ذیل میں اس کا ضروری خلاصہ نقل کیا جاتا ہے:

الحكم فعل للقضاء المطلق	لغت میں حکم کے معنی فیصلہ کرنے کے ہیں
حقاً او باطلاً۔ قال الله تعالىٰ:	عام اس سے کہ حق ہو یا باطل۔ قرآن
مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ (القلم۔	میں ہے، "تمہیں کیا ہوگیا ہے، تم کیسا
۶۸ : ۳۶)۔ ایضاً: اَفَحُكْمَ	فیصلہ کرتے ہو"! نیز فرمایا: "کیا وہ جاہلیت

الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ (المائدة-
۵: ۵۰) ویطلق علی القوة
التی هی منشأ القضاء وحینئذٍ
یراد به الفهم. سیأتیك
شواهده. واما الحکمة
فهی اسم للقوة التی منها
ینشأ القضاء بالحق. قال الله
تعالیٰ فی نعت داؤد: "اٰتَیْنٰهُ
الْحِکْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ"
(صٓ- ۳۸: ۲۰) فذکر الاثر
لبعد القوة التی هی مصدر
تلك الاثر وکما ان القول الفصل
من آثار الحکمة فکذلك
طهارة الخلق وحسن الادب
من آثارها. ولذلك کانت
العرب تطلق اسم الحکمة علی
قوة جامعة لرزانة العقل والرأی
وشرافة الخلق الناشئة منها.
فسموا الرجل العاقل المهذب
حکیما. کذلك یطلقون اسم
الحکمة علی فصل الخطاب وهو

کا فیصلہ چاہتے ہیں'، پھر یہ لفظ اس قوت
کے لیے بولا جاتا ہے جس کی روشنی
سے یہ فیصلہ صادر ہو جاتا ہے۔ اس وقت
اس سے فہم مراد ہوتی ہے، اس کے
شواہد آئیں گے۔ رہا لفظ حکمت تو یہ
اس قوت کے لیے بولا جاتا ہے جو صحیح
فیصلہ کا سرچشمہ ہے۔ حضرت داؤدؑ
کی تعریف میں فرمایا گیا: 'ہم نے اس کو
حکمت دی اور فیصلہ کن بات کرنے
کی لیاقت'۔ یہاں اثر کو اس قوت کے
بعد بیان کیا ہے جو اس اثر کا سرچشمہ
ہے اور جس طرح فیصلہ معاملات حکمت
کے اثرات میں سے ہے اسی طرح اخلاق
کی پاکیزگی اور حسنِ ادب بھی اس کے اثرات
میں سے ہے۔ اسی لیے اہلِ عرب اس
لفظ کو اس قوت کے لیے استعمال کرتے
تھے جو عقل ورائے کی پختگی اور شرافتِ
اخلاق، دونوں کی جامع ہو اور عاقل و
مہذب آدمی کو حکیم کہتے تھے۔ اسی طرح
لفظ حکمت کو فصلِ خطاب کے لیے
بولتے تھے جس سے مقصود ایسی پکی بات

القول الحق او الواضح عند العقل
والقلب وكل هٰذه الوجوه
من معاني الحكمة جاء في
كلام العرب واستعملها القرآن
والنبي صلى الله عليه وسلم
بما عرفوه. قال النبي صلى الله
عليه وسلم : ان من الشعر
لحكمة - اي ليس كل شعر
غواية، بل منه ما يتضمن
على الحق والحث على الخير.
هذا. ثم استعملها الله تعالى
في اكمل افرادها فسمى الوحي
حكمة كما سماه نوراً وبرهانا
وذكراً ورحمة ومن هذه
الجهة سمى القرآن حكيما
اي ذا حكمة كما سمى نفسه
حكيما وعليما۔

ہے جو عقل اور دل، دونوں کے نزدیک
واضح ہو۔ حکمت ان تمام معانی کے لیے
کلامِ عرب میں مستعمل ہے اور چونکہ اہلِ
عرب لفظ کے ان تمام پہلوؤں سے پورے
طور پر باخبر تھے اس لیے قرآن اور پیغمبر
صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو استعمال کیا۔
چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
ہے : شعروں میں سے بعض حکمت ہیں۔
یعنی ہر شعر گمراہی نہیں ہے، کچھ شعر
ایسے بھی ہیں جن میں حق بات کہی گئی
ہے اور جن میں بھلائی پر ابھارا گیا
ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو اس کے
اعلیٰ ترین مفہوم کے لیے استعمال کیا، یعنی
وحی کے لیے وحی کو جس طرح نور، برہان،
ذکر، رحمت وغیرہ کے لفظوں سے تعبیر کیا ہے
اسی طرح اس کو حکمت کے لفظ سے بھی تعبیر کیا
ہے اور اس پہلو سے قرآن مجید کا نام حکیم
رکھا جس طرح اپنی ذات کے لیے حکیم و علیم کے
لفظ استعمال کیے۔

مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ حکمت، کلام اور متکلم دونوں میں پائی جاتی ہے۔ اس کی حقیقت وہ استحکام اور پختگی ہے جو دانش مندی پر مبنی ہو۔ جس طرح آگ

حرارت سے معلوم کی جاتی ہے اسی طرح حکمت اپنے اثرات سے پہچانی جاتی ہے۔ جب یہ کسی شخص کے اندر پیدا ہو جاتی ہے تو اس کے اندر حق شناسی کا ایک ملکہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی زبان سے جو بات بھی نکلتی ہے حق نکلتی ہے اور اس سے جو فعل بھی صادر ہوتا ہے ٹھیک صادر ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں، لقمان کے قصہ میں اس کے اثرات بیان کیے گئے ہیں۔ یہی چیز خدا کی آنکھ اور خدا کا ہاتھ ہے۔ جو اس سے دیکھتا ہے اس کی رات بھی دن کی طرح روشن ہے۔ وہ تنگ و تاریک راہوں میں بھی لغزشوں اور ٹھوکروں سے محفوظ رہتا ہے۔ وہ قطروں میں سمندر کا مشاہدہ کرتا ہے اس وجہ سے شریعت کی رائی کو بھی پربت سمجھتا ہے جو چیز دوسروں کے نزدیک سنگ ریزے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی وہ اس کے اندر ہیرے کی جوت دیکھ لیتا ہے۔

اسی طرح جب یہ کسی کلام میں پائی جاتی ہے تو وہ کلام عقل کی راہ سے دل میں اتر جاتا ہے، وہ ہر وسوسہ کو مٹا دیتا ہے، ہر شبہ کو دھو دیتا ہے، ہر دعویٰ کو باطل کر دیتا ہے، ہر جھوٹی منطق کو منہدم کر دیتا ہے:

جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ط	حق آگیا اور باطل نابود ہو گیا اور باطل
اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ہ	نابود ہونے والی چیز ہے۔

(بنی اسرآءیل - ۱۷: ۸۱)

اور یہی قرآن مجید کی خصوصیت ہے

ایک ضروری نکتہ:

اس موقع پر حکمت کی عظمت و اہمیت کا اندازہ کرنے کے لیے ایک ضروری نکتہ بھی سمجھ لیجیے جس سے ضمناً تورات اور قرآن مجید کا باہمی فرق بھی نمایاں ہو جائے گا۔ قرآن مجید میں تورات کی جو صفات و خصوصیات بیان ہوئی ہیں ان میں کہیں

حکمت کا ذکر نہیں آیا ہے، بلکہ بعض مواقع میں، صاف تصریح ہے کہ تورات قانون ہے اور انجیل حکمت، البتہ کہیں کہیں اس کا موعظت پر مشتمل ہونا بیان کیا گیا ہے مثلاً:

وَكَتَبْنَا لَهُ فِي الْأَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَوْعِظَةً وَتَفْصِيلًا لِكُلِّ شَيْءٍ	ہم نے اس کے لیے تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل لکھ دی۔

(الاعراف - ۷ : ۱۴۵)

اب سوال یہ ہے کہ موعظت کیا ہے؟ جہاں تک ہم نے غور کیا ہے موعظت حکمت کی ایک شاخ ہے، عین حکمت نہیں ہے حکمت موعظت سے بہت بلند چیز ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ انہی اشخاص یا انہی جماعتوں کو ملتی ہے جو عقل کی پوری پختگی کو پہنچ گئے ہوں۔ جب تک کوئی قوم ذہنی اعتبار سے عہدِ طفولیّت میں ہوتی ہے اس وقت تک اللہ تعالیٰ اس کو حکمت سے نہیں سرفراز فرماتا بلکہ زندگی کو ٹھیک طور پر بسر کرنے کے لیے اس کو ایک ضابطۂ شریعت عنایت فرماتا ہے اور فکر و نظر کی معمولی لغزشوں سے بچنے کے لیے اس کو بقدرِ فہم و استعداد موعظت بخشی جاتی ہے۔ سورۂ اعراف میں اس حقیقت کی طرف نہایت لطیف اشارہ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب طُور پر پہنچے انہوں نے خدا کو دیکھنے کی خواہش کی۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا تم مجھے نہیں دیکھ سکتے۔ میرے جلوہ کی تاب تو پہاڑ بھی نہیں لا سکتا چہ جائیکہ انسان کا دل۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنی تجلی پہاڑ پر ڈالی پہاڑ پاش پاش ہوگیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام غش ہو گئے۔ پھر جب ہوش میں آئے تو انہوں نے فوراً توبہ کی:

سُبْحَانَكَ تُبْتُ إِلَيْكَ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُؤْمِنِينَ ٥	اے میرے رب! تو پاک ہے۔ اب میں نے تیری طرف رجوع کیا اور میں

(الاعراف - ۷ : ۱۴۳) پہلا ایمان لانے والا بنتا ہوں۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَبِكَلَامِىْ ۖ فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ○	اے موسیٰ ! میں نے تم کو لوگوں پر اپنے پیغام اور اپنے کلام سے سرفراز کیا تو میں نے جو کچھ تم کو دیا اس کو لو اور شکر گزاروں میں سے بنو۔

(الاعراف - ۷ : ۱۴۴)

ان الفاظ پر غور کیجیے۔ سیاقِ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کمالِ معرفت کی تمنا کی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ تمنا نہ کرو۔ کمالِ معرفت کا بوجھ کوہ و جبل بھی نہیں سہار سکتے، تم کیسے سہار سکو گے ؟ جتنا ملا ہے اس پر قناعت کرو اور خدا کے شکر گزار رہو۔

یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کامل حکمت کی مستحق نہیں ٹھہری۔ اس کو صرف قانون اور موعظت دی گئی اس لیے کہ اس کی ذہنی اور قلبی استعداد اس سے زیادہ کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد جو انبیاء آئے انہوں نے آہستہ آہستہ بنی اسرائیل کو کسی قدر حکمت سے آشنا کرنا چاہا، لیکن انہوں نے اس کی قدر نہیں کی۔ یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئے جن کو اللہ تعالیٰ نے صحیفۂ حکمت عنایت فرمایا تھا۔ لیکن، جیسا کہ خود ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، اس وقت تک بھی بنی اسرائیل کی ذہنی استعداد کامل حکمت کے تحمّل کے لائق نہ ہوئی تھی۔ چنانچہ انہوں نے فرمایا کہ "مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہے مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے"[1]۔ اور کامل حکمت کی تعلیم کا معاملہ

[1] انجیل یوحنا۔ باب ۱۶ : ۱۲

اپنے بعد آنے والے پر چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔

یہ بعد میں آنے والا جب آیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو ایک ایسی کتاب سے سرفراز فرمایا جو تورات کی طرح صرف قانون ہی نہیں ہے، بلکہ انجیل کی طرح اس میں حکمت و موعظت بھی ہے اور حکمت کا وہ حصہ بھی اس میں ہے جس کی تعلیم حضرت مسیحؑ نے قوم کی عدم صلاحیت کی وجہ سے ملتوی کر دی تھی۔ کتاب اور حکمت کا یہی مجموعہ ہے جس کو ہم قرآن کے نام سے جانتے ہیں۔ چونکہ یہ کامل حکمت سے معمور ہے اس وجہ سے اس میں کمال عرفان کی وہ تمام تجلیاں بھی بند ہیں جن کی ایک ادنیٰ نمود نے طور کو پاش پاش اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بیہوش کر دیا تھا۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کی رحمت مقتضی ہوئی اس نے ایک ایسے انسان کو پیدا کر دیا جس نے وہ بوجھ اٹھا لیا جو طورؔ نہ برداشت کر سکا تھا۔ سورۂ حشر کی یہ آیت قرآن حکیم کی اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے:

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ ؕ	اگر اس قرآن کو ہم کسی پہاڑ پر اتارتے تو تم دیکھتے کہ وہ خشیت الٰہی سے پست اور پاش پاش ہو جاتا۔

(الحشر - ۵۹ : ۲۱)

یہی راز ہے کہ تورات کا بیک دفعہ نازل ہونا تو ممکن ہوا لیکن قرآن حکیم بیک دفعہ نہیں، بلکہ تھوڑا تھوڑا نازل ہوا تاکہ قلب انسانی تدریجی تربیت کے ذریعہ سے آہستہ آہستہ ان تجلیوں کو برداشت کرنے کے قابل ہو جائے اور ان کو اپنی گرفت میں لے سکے۔ کفار و مشرکین، یہود کے اشارہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرتے تھے کہ قرآن مجید تورات کی طرح پورا کا پورا ایک ہی دفعہ کیوں نہیں نازل ہو جاتا۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ

بِهٖ فُؤَادَكَ ' (الفرقان - ۲۵ : ۳۲) ایسا اس لیے ہوا تاکہ اس کے تحمل کے لیے ہم تمہارے قلب کو مضبوط کردیں۔ غور کیجیے کہ جو مقدس سینہ ' اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ' (الم نشرح - ۹۴ : ۱) (کیا ہم نے تمہارا سینہ کھول نہیں دیا) کے انوار سے معمور تھا اس کے لیے بھی قرآن کا تحمل کچھ آسان نہ تھا۔ پھر عام لوگوں کا کیا حال ہوتا جن کی استعداد اور نبیؐ کی استعداد میں آسمان و زمین کا فرق تھا۔

یہ ایک طویل داستان تھی جس کی طرف چند لفظوں میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حکمت کی عظمت و اہمیت کا کیا حال ہے، قرآن مجید میں اس کا مقام کیا ہے اور اس کے لیے فکر و نظر اور قلب و دماغ کی کیا کیا صلاحیتیں درکار ہیں۔

قرآن مجید محلِ تدبّر ہے :

اس تمام تفصیل کا خلاصہ یہ نکلا کہ قرآن مجید کے متعلق یہ خیال بالکل غلط ہے کہ وہ محض احکام و قوانین کا مجموعہ ہے اور کلام کی اس صنف میں داخل ہے جس کو سمجھنے کے لیے کسی خاص ذہنی کاوش اور فکر و تدبّر کی ضرورت نہیں ہے، ہر شخص جو عربی عبارتوں کا الٹا سیدھا ترجمہ کر سکتا ہے، قرآن مجید کی تاویل و تفسیر بھی کر سکتا ہے۔ بلاشبہ وہ عام تعلیم کے اعتبار سے، نہایت کھلا ہوا اور آسان ہے، ہر شخص بقدرِ استعداد اس سے فیض حاصل کر سکتا ہے۔ زندگی کو جس روش پر گزارنا چاہیے اس کی طرف پہلی ہی نظر میں اشارہ کر دیتا ہے۔ کرنے کی تمام باتیں اور بچنے کی تمام چیزیں بغیر کسی ایچ پیچ کے، نہایت واضح لفظوں میں، بتا دیتا ہے۔ حرام و حلال کے تمام حدود، بالکل متعین الفاظ اور نپے تلے جملوں میں مقرر کر دیتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے اندر ایک عمیق فلسفہ اور گہری حکمت بھی رکھتا ہے، جس کا گہراؤ اتھاہ اور

جس کی وسعت ناپیدا کنار ہے۔ اس کے لیے صرف عربی زبان دانی ہی کافی نہیں ہے، بلکہ تدبّر کی بھی ضرورت ہے۔ صرف پیرنا ہی کافی نہیں بلکہ ڈوبنا بھی پڑتا ہے۔ راہ چلتوں کی طرح صرف گزر ہی نہیں جانا چاہیے بلکہ لفظ لفظ پر رک کر ایک ایک گوشہ کی تفتیش کرنی چاہیے۔ پھر ایسا صرف ایک بار نہیں، بلکہ جیسا کہ احادیث میں وارد ہے، بار بار کرنا چاہیے۔ یہ پیہم مطالعہ اور مسلسل غور و فکر کی چیز ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

تعاهدوا هذا القرآن	اس قرآن کی برابر نگہداشت کرو اس لیے کہ
فوالذی نفس محمد بیده	اس ذات کی قسم جس کی مٹھی میں محمد کی جان
لهو اشد تفلتا من	ہے، یہ اپنے بندھن سے نکل بھاگنے والے
الابل فی عقلها[1]	اونٹ سے کہیں زیادہ سبک رو ہے۔

یہی وجہ تھی کہ اس کے اسرار و حقائق پر غور کرنے کے لیے ذہین صحابہؓ کے حلقے قائم تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسے حلقوں کے قیام کے لیے مؤثر الفاظ میں لوگوں کو شوق دلایا کرتے تھے۔ ابوداؤد میں روایت ہے:

ما اجتمع قوم فی بیت من	جو لوگ کسی جگہ جمع ہو کر اللہ کی کتاب پڑھتے
بیوت الله یتلون کتاب الله	اور باہم درس و مذاکرۂ قرآن کی مجلسیں قائم
ویتدارسونه بینهم الا نزلت	کرتے ہیں ان پر اللہ کی طرف سے تسکین اور
علیهم السکینة وغشیتهم	رحمت کی بارش ہوتی ہے اور ملائکہ ان کو
الرحمة وحفتهم الملئكة	ہر طرف سے گھیرے کھڑے رہتے اور اللہ تعالےٰ
وذکرهم الله فیمن عنده[2]	اپنے مقرّبین کے حلقہ میں ان کا ذکر فرماتا ہے۔

---

[1] صحیح مسلم: کتاب صلوٰۃ المسافرین وقصرها، باب ۳۳

[2] سنن ابی داؤد: کتاب الوتر، باب ۱۴

اس حدیث سے صرف یہی نہیں معلوم ہوتا کہ اس طرح کی مجالس کے قیام میں بڑی برکت ہے، بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں اس چیز کا بڑا چرچا تھا۔ اس زمانہ میں قرآن مجید کے مذاکرہ و مطالعہ کی یہ مجلسیں منعقد ہوتی تھیں، صحابہؓ ان میں شریک ہوتے تھے۔ آیاتِ قرآن پر غور کرتے تھے، مشکلات میں ایک دوسرے کی رہنمائی سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی کبھی کبھی ان مجالس میں شرکت فرماتے تھے، یہاں تک کہ بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے فکر و تدبر کی ان مجلسوں کو ذکر و عبادت کی مجلسوں پر ترجیح دی اور زاہدوں، عابدوں کی ایک مجلس کو چھوڑ کر اہلِ علم کی ایک مجلس میں یہ کہہ کر بیٹھ گئے کہ میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

سوچنے کی بات ہے کہ آخر صحابہؓ کس چیز پر غور و تدبر کرتے تھے؟ زبان اُن کی تھی، اس کے اسالیب و قواعد ان کے غور و بحث کی چیز نہ تھے۔ قرآن جن حالات و واقعات پر اترتا تھا وہ تمام تر خود ان کے ہوتے تھے، ان کے جاننے لیے ان کو کوئی کاوش نہیں کرنی پڑتی تھی۔ تلمیحات و اشارات کا تعلّق ایسی باتوں سے تھا جن کی تفصیلات پر وہ روزانہ گفتگو میں کرتے تھے۔ خیالات، عقائد، اعمال و افعال اور معروف و منکر جن پر قرآن بحث کرتا تھا، وہ سرتاسر خود ان کی اپنی سرگزشت تھے۔ پچھلی قوموں کے حالات جو قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں وہ ان کے روزانہ کے چرچے تھے۔ یہود و نصاریٰ کے خیالات و عقائد یا حالات و واقعات جن کی طرف قرآن مجید نے اشارہ کیا ہے، ان سے بھی وہ گوناگوں تعلقات کی وجہ سے بخوبی باخبر تھے۔ پھر قرآن میں ایسی کیا چیز تھی جس پر ان کو غور کرنا تھا؟ لیکن ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غور و تدبر کیا کرتے تھے اور معمولی غور و تدبر نہیں بلکہ ایسا غور و تدبر جس کی مثالیں تحقیق و تنقید کے اس روشن عہد میں بھی زیادہ

ذل سکیں گی۔ چنانچہ مؤطا میں ایک روایت ہے: "ان عبد اللہ بن عمر مکث علی سورۃ البقرۃ ثمانی سنین یتعلمھا"[1] حضرت عبد اللہ بن عمرؓ مسلسل آٹھ برس تک سورہ بقرہ پر تدبر فرماتے رہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کو ان تمام وادیوں میں سے کسی ایک وادی سے بھی گزرنا نہیں تھا، جن سے اب قرآن مجید کے ہر طالب علم کو گزرنا پڑتا ہے۔ ان کی راہ نہایت سیدھی اور صاف تھی۔ قرآن مجید کے فہم و تدبر کے لیے جن چیزوں کے ہم محتاج ہیں ان میں سے اگر کُل سے نہیں تو بیشتر سے وہ بالکل بے نیاز تھے۔ ان کے فکر و نظر کی چیز صرف قرآن کے اسرار و حکَم تھے۔ ہمارے مروّجہ علم و فنون کی یہ تمام حصار بندیاں بھی ان کے اردگرد نہ تھیں۔ اس آسمان کے نیچے صرف ایک ہی کتاب تھی جس کا علم و عمل اور جس کا درس و مطالعہ ان کی تمام زندگی اور زندگی کے تمام ولولوں اور حوصلوں کا مرکز تھا۔ تاہم آپ نے دیکھا کہ وہ قرآن مجید کی ایک ایک سورہ پر آٹھ آٹھ برس تدبر فرماتے تھے۔ ان کو نہ تو قرآن مجید کی زبان سیکھنی تھی، نہ اس کے شانِ نزول اور اس کے ناسخ و منسوخ کے جھگڑوں میں الجھنا تھا۔ زبان ان کی تھی، مذاق ان کا تھا، خیالات ان کے تھے، حالات و معاملات اور عقائد و اعمال سب ان کے تھے۔ تاہم ایک ایک سورہ پر آٹھ آٹھ سال تدبر کرنے کے بعد بھی وہ آسودہ نہیں ہوتے تھے۔ پھر ہمارے لیے جو قرآن کی ہر چیز سے بیگانہ ہیں اور جن کو اس سے مانوس ہونے کے لیے صدہا چیزوں سے واقف ہونا پڑتا ہے یہ خیال کرنا کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید ایک نہایت کھلی ہوئی کتاب ہے جس کو سمجھنے کے لیے کسی خاص کاوش و اہتمام کی ضرورت نہیں ہے۔

1۔ مؤطا امام مالک: کتاب القرآن، باب ۴

یہ صحابہ کرامؓ کی زندگی کی کھلی ہوئی شہادتیں ہیں۔ اس کے علاوہ خود قرآن مجید پر بھی نظر ڈالیے تو مشکل ہی سے کوئی سورہ ہوگی جو فکر و نظر اور تفکر و تدبر کی دعوت سے خالی ہو۔ ہر قدم پر 'لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ' (تاکہ سمجھو) ہر چند آیات کے بعد 'لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ' (تاکہ غور کرو) ہر تھوڑے تھوڑے فاصلہ کے بعد 'لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ' (تاکہ یاد دہانی حاصل کرو) کی دعوت بلند ہوتی ہے۔ سورہ قٓ میں قرآن مجید کے فہم کے لیے ضروری شرط یہ بتائی ہے کہ:

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ	بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے بڑی
كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى	یاد دہانی ہے جن کے پاس دل ہو یا وہ
السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ ۝	بات سننے کے لیے کان لگائیں متوجہ
(قٓ - ۵۰ : ۳۷)	ہو کر۔

یعنی قرآن مجید سے فائدہ اٹھانے کے لیے اوّلین شرط یہ ہے کہ سینہ میں بیدار و ہشیار دل ہو جو فہم کا سرچشمہ ہے اور اگر بیدار دل نہ ہو تو کم از کم سننے والے کان ہوں، جو پوری دلجمعی اور یکسوئی کے ساتھ، قرآن مجید کی باتوں پر جم جائیں تاکہ قرآن ان کے راستہ سے دلوں تک اتر سکے۔ اگر ان باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے، نہ دل کی ہوشیاری و بیداری ہی موجود ہے، نہ سماعت کی یکسوئی اور دلجمعی ہی پائی جاتی ہے تو ایسے شخص کے لیے قرآن سے فیض یاب ہونا ناممکن ہے۔ قرآن کے سمجھنے کے لیے ان دونوں باتوں میں سے کسی ایک کا ہونا ناگزیر ہے۔ یا تو آدمی کے سینہ کے دروازے کھلے ہوئے ہوں اور فہم و ادراک کی روشنی اس کے اندر زندہ ہو یا یہ کہ اپنے کانوں کو وہ اس کے لیے کھول دے اور طبیعت کی آمادگی کے ساتھ اس کا خیر مقدم کرے۔

جو لوگ ان دونوں باتوں سے محروم ہیں وہ قرآن مجید کے فیض سے محروم ہیں۔ ان لوگوں کی تصویر سورہ محمدؐ میں ان الفاظ میں کھینچی گئی ہے:

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ — کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے یا دلوں

اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ۝ — پر تالے چڑھے ہوئے ہیں!

(محمد - ۴۷ : ۲۴)

یہ منافقین کا حال بیان ہوا ہے۔ منافقین قرآن مجید پڑھتے تھے لیکن دلجمعی اور حضورِ قلب کے ساتھ نہیں، بلکہ بے دلی اور نفرت کے ساتھ پڑھتے تھے۔ وہ قرآن مجید کی آیتوں پر سے سرسری گزر جاتے تھے حالانکہ اس سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ اس پر تدبر کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن مجید کی تلاوت کے باوجود وہ عقیدہ اور عمل کی تمام خرابیوں میں مبتلا ہے۔

اصل یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے قرآن مجید کی اصلی نوعیت آئی ہی نہیں۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت تو یہی ہے کہ یہ فکر و تدبر کی چیز ہے۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہے کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو آدمی کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اس پر تدبر کرے۔ اس کا اندازِ بحث و استدلال ہمارے منطقیوں کے ڈل کر دینے والے انداز بحث و استدلال سے بالکل مختلف ہے۔ اس کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ صغریٰ و کبریٰ بنائے اور پھر نتیجہ نکال کر مخاطب کو چپ کر دے۔ قرآن مجید دنیا کو چپ کرنے کے لیے نہیں آیا ہے، بلکہ عقلِ انسانی کی تربیت کے لیے آیا ہے۔ وہ یہ کرتا ہے کہ آدمی کے فکر و استدلال کی قوتوں کو شہ دے کر ابھارتا ہے اور پھر ان کو اس راہ پر لگا دیتا ہے جو فطرت کی راہ ہے اور جس میں کوئی کج پیچ نہیں ہے۔ اس کا عام طریقہ یہ ہے کہ وہ دلائل اور آیات کی طرف انگلی اٹھا دیتا ہے، استدلال کے بعض پہلوؤں کو کسی قدر بے نقاب کر دیتا ہے، نتیجہ کے بعض گوشوں کی طرف کبھی کبھی اشارہ کر دیتا ہے۔ باقی رہا صغریٰ و کبریٰ کی تمام کڑیوں کو ملانا اور نتیجہ تک پہنچنا تو یہ کام وہ خود نہیں انجام دیتا بلکہ اس کو

وہ مخاطب پر چھوڑ دیتا ہے تاکہ وہ تدبّر کرے اور خود اپنی رہنمائی میں ان نتائج تک پہنچ جائے، جن تک پہنچنا چاہیے۔ وہ چند چیزوں کا نام لے دینے کے بعد یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے کہ 'اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ' اس میں دلیلیں ہیں۔ کیا دلیلیں ہیں ؟ عموماً وہ اس کی تفصیل نہیں کیا کرتا، بلکہ اس کام کو وہ مخاطب پر چھوڑ دیتا ہے۔ یہ مخاطب کا فرض ہے کہ وہ تدبّر کرے اور موقعِ کلام کے حدود کے اندر رہ کر ان دلیلوں کا 'سراغ' لگائے۔

سورۂ نحل کے ایک مقام پر غور کیجیے، قرآن مجید کے طریقِ استدلال کی پوری حقیقت آپ پر بے نقاب ہو جائے گی :

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ
مَآءً لَّکُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ
شَجَرٌ فِیْهِ تُسِیْمُوْنَ ۝ یُنْۢبِتُ
لَکُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّیْتُوْنَ
وَالنَّخِیْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ
کُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ
لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ۝ وَ
سَخَّرَ لَکُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ ۙ
وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ وَالنُّجُوْمُ
مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ
ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝ۙ
وَمَا ذَرَاَ لَکُمْ فِی الْاَرْضِ
مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ؕ اِنَّ

وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا
جس میں سے تم پیتے بھی ہو اور اس سے
وہ نباتات بھی اگتی ہیں جن میں تم مویشیوں
کو چراتے ہو۔ وہ اس سے تمہارے لیے
کھیتی، زیتون، کھجور، انگور اور ہر قسم کے
پھل پیدا کرتا ہے۔ بے شک اس کے
اندر بہت بڑی نشانی ہے ان لوگوں
کے لیے جو سوچیں۔ اور اس نے رات
اور دن، سورج اور چاند کو تمہاری نفع
رسانی میں لگا رکھا ہے اور ستارے بھی
اسی کے حکم سے نفع رسانی میں لگے ہوئے
ہیں، بے شک اس میں نشانیاں ہیں
ان لوگوں کے لیے جو سمجھیں۔ اور زمین

فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوْمٍ یَّذَّکَّرُوْنَ ٥ (النحل - ١٦ : ١٠ - ١٣)	میں جو چیزیں تمہارے لیے گوناگوں قسموں کی پھیلائیں، بے شک اس میں بھی بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو یاددہانی حاصل کریں۔

یہاں علی الترتیب تین لفظ آئے ہیں: 'لِقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ' (ان لوگوں کے لیے جو سوچیں) 'لِقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ' (ان لوگوں کے لیے جو سمجھیں) 'لِقَوْمٍ یَّذَّکَّرُوْنَ' (ان لوگوں کے لیے جو یاددہانی حاصل کریں)۔ پھر ایک جگہ فرمایا: 'اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً' (النحل - ١٦ : ١١) اس میں ایک بہت بڑی دلیل ہے۔ کیا دلیل ہے؟ کچھ نہیں بتایا۔ تفکّر سے معلوم ہوگی۔ دوسری جگہ فرمایا: 'اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ' (النحل - ١٦ : ١٢) اس میں دلیلیں ہیں۔ کیا دلیلیں ہیں اور کس چیز پر ہیں؟ ان سوالوں کا بھی جواب نہیں دیا بلکہ فرمایا جو عقل سے کام لیں گے وہ خود پا جائیں گے۔ پھر بعض چیزوں کی طرف اشارہ کرکے فرمایا: 'اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً' اس میں ایک دلیل ہے۔ کیا دلیل ہے، کس بات پر دلیل ہے؟ اس کا بھی جواب نہیں دیا تاکہ مخاطب کی قوّتِ فکر و تدبّر خود اپنا کام کرے اور ان دلیلوں کو معلوم کرے۔

دلائل اور حکمت کی باتیں بیان کرنے کے لیے قرآن مجید کا عام ڈھنگ یہی ہے جو اوپر بیان ہوا۔ وہ حکمت کا ایک وافر ذخیرہ اور ایک بے پایاں خزانہ آیات کے پردوں میں چھپا دیتا ہے تاکہ انسان خود ان پردوں کو ہٹائے اور جس قدر اس میں سے لے سکتا ہے لے لے۔ اصل چیز حکمت کو دریافت کرنے کا سلیقہ ہے۔ اگر یہ سلیقہ کسی شخص کے اندر پیدا ہو جائے تو قرآن مجید میں حکمت کا ایسا خزانہ مدفون ہے جو کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ خود قرآن کا اپنا بیان یہ ہے:

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ۝ (الکہف - ۱۸ : ۱۰۹)

کہہ دو: اگر میرے رب کی نشانیوں کو قلم بند کرنے کے لیے سمندر روشنائی بن جائے تو میرے رب کی نشانیوں کے ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائے گا اگرچہ ہم اس کے ساتھ اسی کے مانند اور سمندر ملا دیں۔

ترمذی کی ایک حدیث میں بھی یہ حقیقت نہایت خوبی سے بیان ہوئی ہے۔ حارث اعور راوی ہیں:

مررت فی المسجد فاذا الناس یخوضون فی الاحادیث۔ فدخلت علی علی فقلت: یا امیر المؤمنین! الاتری ان الناس قد خاضوا فی الاحادیث؟ قال: وقد فعلوها؟ قلت: نعم۔ قال: اما انی قد سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: الا! انہا ستکون فتنۃ۔ فقلت: فما المخرج منها یا رسول اللہ؟ قال: کتاب اللہ! فیہ نبأ ما قبلکم وخبر ما بعدکم وحکم

میں مسجد میں داخل ہوا تو دیکھا کہ کچھ لوگ بعض مسائل میں کرید کر رہے ہیں۔ میں نے حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا: یا امیر المؤمنین! آپ کے علم میں ہے کہ کچھ لوگ بعض مسائل میں کریدی کر رہے ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا: اچھا یہ باتیں ہونے لگیں؟ میں نے عرض کیا جی ہاں! فرمایا: یاد رکھو! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات سنی ہے آپ نے فرمایا کہ عنقریب ایک بڑا فتنہ سر اٹھائے گا۔ میں نے عرض کیا: اس سے نجات کیا چیز دلائے گی، یا رسول اللہ؟ آپ نے فرمایا: اللہ کی کتاب! اس میں تمہارے پہلوں کی سرگزشت ہے

ما بينكم۔ وهو الفصل ليس
بالهزل ۔ من تركه من
جبار قصمه الله ومن
ابتغى الهدى في غيره
اضلّه الله ۔ وهوجل الله المتين
وهو الذكر الحكيم وهو الصراط
المستقيم۔ هو الذي
لا تزيغ به الاهواء ولا تلتبس
به الالسنة ۔ ولا تشبع منه
العلماء ولا يخلق على
كثرة الرد ولا تنقضي عجائبه
هو الذي لم تنته
الجن اذا سمعته حتّى
قالوا: اِنَّا سَمِعْنَا
قُرْاٰنًا عَجَبًا يَّهْدِيْ
اِلَى الرُّشْدِ (الجن ۔ ۷۲ : ۱-۲)
من قال به
صدق ومن عمل به
اجر ومن حكم
به عدل، ومن
دعا اليه هدى

جو کچھ بعد میں آنے والا ہے اس کی خبر ہے
اور جو کچھ تمہارے درمیان پیدا ہوگا
اس کا فیصلہ ہے اور یہ ایک دوٹوک بات
ہے، کوئی ہنسی دل لگی نہیں ہے۔ جو سرکش
اس کو چھوڑے گا اللہ اس کی پشت کی
ہڈی توڑ دے گا۔ جو اس کے سوا کوئی اور
مرجع ہدایت بنائے گا خدا اس کو گمراہ
کر دے گا۔ خدا کی مضبوط رسی یہی ہے،
حکمت سے بھری ہوئی کتاب یہی ہے،
خدا کی کھولی ہوئی سیدھی راہ یہی ہے۔ اس
کے ہوتے خواہشیں نہیں گمراہ کرتیں اور
زبانیں نہیں لڑکھڑاتیں، علماء اس سے
کبھی آسودہ نہیں ہوتے۔ کتنی ہی پڑھو اس
سے سیری نہ ہو گی۔ اس کے عجائب حکمت
کبھی ختم نہ ہوں گے۔ اس کو سنتے ہی جن
پکار اٹھے: "ہم نے ایک نہایت دل پذیر
قرآن سنا جو ہدایت کی راہ بتاتا ہے تو ہم
اس پر ایمان لائے"۔ جس نے اس کی سند
پر کہا، سچ کہا۔ جس نے اس پر عمل کیا اجر
پائے گا۔ جس نے اس کی مدد سے فیصلہ
کیا اس نے عدل کیا۔ جس نے اس کی طرف

الی صراط مستقیم۔ خذھا الیک، یا اعود[1]!	دعوت دی اس نے صراطِ مستقیم کی دعوت دی اعوران باتوں کو گرہ کر لو۔

وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ کی صحیح تاویل:

اس سلسلہ میں ایک اور بات رہ گئی ہے، تھوڑی دیر توقف کر کے، اس پر بھی غور کر لینا چاہیے۔ جو لوگ قرآن مجید کو غور و فکر کی چیز نہیں سمجھتے وہ عموماً آیت "وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ (القمر۔۵۴:۲۲) (اور ہم نے قرآن کو تذکیر کے لیے نہایت سازگار بنایا ہے تو ہے کوئی یاد دہانی حاصل کرنے والا!) سے حجت پکڑتے ہیں۔ اس آیت کو دلیل ٹھہرا کر وہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید ایک سیدھی سادی کتاب ہے۔ پند و موعظت کی ضروری باتیں اس میں نہایت آسان لفظوں میں بیان کر دی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خود اس کی تعریف میں فرمایا ہے کہ ہم نے اس کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے نہایت آسان بنایا۔ پھر اس کی ایک ایک سورہ پر آٹھ آٹھ برس تک سر کھپانے کی کیا ضرورت ہے؟ ہر شخص جو عربی جملوں کا مطلب سمجھ سکتا ہے وہ بے تکلف قرآن مجید کی آیتوں کے معانی و مطالب بھی سمجھ سکتا ہے، وہ خواہ مخواہ کے لیے روایات، تفاسیر اور شانِ نزول وغیرہ کا ممنونِ احسان کیوں ہو؟ اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم یہاں مختصراً آیت "وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ" کا صحیح مفہوم بیان کر دیں۔

قرآن مجید کے ایک سپاٹ کتاب ہونے کے ثبوت میں عموماً لوگ اس آیت

---

[1] جامع الترمذی: کتاب فضائل القرآن؛ باب ۱۴

کوشش کرتے ہیں، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ لوگوں نے خود اس آیت کے اصل مفہوم پر غور نہیں کیا۔ اس آیت کا عام طور پر جو مطلب مشہور ہے وہ یہ ہے کہ قرآن مجید نصیحت حاصل کرنے کے لیے نہایت آسان کتاب ہے۔ یہ بات بجائے خود نہایت صحیح ہے، لیکن اس آیت کا یہ مطلب صحیح نہیں ہے۔ بلاشبہ تفسیر کی کتابوں میں اس آیت کی تاویل میں بعض ایسے اقوال بھی نقل ہو گئے ہیں جو غلط فہمی پیدا کرنے والے ہیں، مثلاً بعضوں نے کہا ہے کہ قرآن مجید حفظ کرنے کے لیے نہایت آسان کتاب ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کی تاویل میں سلف سے ایسے اقوال بھی نقل ہیں جو اصل حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ لیکن اردو مترجمین کو اس کے صحیح مفہوم کے ادا کرنے میں دقتیں پیش آئی ہیں جس کا سبب زیادہ تر اردو زبان کی بے مائیگی اور نارسائی ہے۔ بسا اوقات عربی زبان کا ایک چھوٹا سا لفظ جن وسیع معانی پر مشتمل ہوتا ہے اردو زبان کا ایک پورا فقرہ بھی ان کو نہیں سمیٹ سکتا۔ ایسے مواقع پر مترجمین مجبوراً ادائے مطلب کے لیے کوئی ایسا لفظ اختیار کر لیتے ہیں جو مفہوم کو بس ایک حد تک تعبیر کر دیتا ہے۔ یہ ترجمہ اور تعبیر کی عالمگیر مشکل ہے جو ہر زبان کے مترجم کو پیش آتی ہے۔ لیکن جو شخص قرآن مجید کا ترجمہ اردو میں کرنا چاہے اس کے سامنے تو بسا اوقات ایسی مشکلیں آجاتی ہیں کہ بالکل ہی عاجز کر دینے والی ہوتی ہیں۔

اسی قسم کی مشکل اس آیت میں بھی موجود ہے۔ اس وجہ سے اس کے دو لفظوں 'یَسَّرْنَا' اور 'لِلذِّکْرِ' پر ہم لغت، کلامِ عرب اور قرآن مجید کی روشنی میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

اربابِ تاویل نے 'یَسَّرْنَا' کا مفہوم مختلف لفظوں سے ادا کیا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں: 'ھوناہ'، ہم نے اس کو آسان کر دیا۔ ابن زید فرماتے ہیں: 'بَیَّنَّاہُ'، ہم نے اس کو کھول دیا ہے۔ ہمارے اردو مترجمین اس کا ترجمہ کرتے ہیں: "ہم نے آسان بنایا"

لیکن اہل علم جانتے ہیں کہ ان تمام تعبیروں میں سے کوئی تعبیر بھی ایسی نہیں ہے جو اس لفظ کی صحیح روح کو پیش کرتی ہو اور جس سے اس لفظ کے تمام اطراف وجوانب روشنی میں آجاتے ہوں۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ان سے لفظ کا مفہوم ایک حد تک ادا کر دیا گیا ہے۔

یسر، کے معنی اصل لغت میں نرمی اور فرمانبرداری کے ہیں۔ اسی سے تیسیر ہے، جس کے معنی ہیں کسی شے کو کسی مقصد کے لیے بالکل موزوں، صالح، موافق اور ساز گار بنا لینا۔ مثلاً کہیں گے: 'یسّر الفرس' اس کے معنی ہوں گے: گھوڑے کو زین، رکاب اور لگام سے آراستہ کر کے سواری کے لیے بالکل تیار کر لیا۔ 'یسر ناقته للسفر اذا رحلها و یسر الفرس للغزو اذا اسرجه والجمه'۔ اعرج معنّی کا شعر ہے:

قمت الیه باللجام میسرا

هنالك یجزینی الذی کنت اصنع

(میں اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا اور حال یہ تھا کہ وہ لگام کے ساتھ بالکل تیار کھڑا تھا۔ ایسے ہی وقتوں میں وہ میرے احسانات کا حق ادا کرتا ہے۔)

یعنی جس چیز سے جو کام لینا ہے یا جو مقصد حاصل کرنا ہے، اس مقصد کے لیے اس کو اس قدر ساز گار اور مناسب بنا لیا جائے کہ اگر کوئی شخص اس سے وہ مقصد حاصل کرنا چاہے تو بہتر سے بہتر طریقہ پر حاصل کر سکے، یہاں تک کہ اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیے اس سے زیادہ قریبی اور آسان راہ کوئی دوسری نہ باقی رہ جائے۔ یہیں سے اہل اور لائق بنانے کا مفہوم بھی اس لفظ میں پیدا ہو گیا ہے۔ مضرّس بن ربعی کا شعر ہے:

ونعین فاعلنا علی ما نابه

حتی نیسره لفعل السید

(ہمارے سردار کو جو مشکلیں پیش آتی ہیں ہم اس میں اس کی مدد کرتے ہیں، یہاں تک کہ اس کو سرداری کے کام کا اہل بنا دیتے ہیں۔)

'لِلذِّکْرِ' کا ترجمہ بعض مترجمین نے 'نصیحت حاصل کرنے کے لیے' کیا ہے اور بعض نے سمجھنے کے لیے۔ ہمارے نزدیک یہ دوسرا ترجمہ لفظ کی روح سے زیادہ قریب ہے، گو اصل لفظ کا پورا قائم مقام یہ بھی نہیں ہے۔ 'ذکر' کے اصلی معنی یاد کرنے اور بیان کرنے کے ہیں۔ یہ لفظ قرآن مجید میں کتاب آسمانی کے لیے بھی استعمال ہوا ہے، مثلاً: 'فَاسْئَلُوْآ اَھْلَ الذِّکْرِ' (الانبیآء - ۲۱: ۷) (تو اہلِ کتاب سے پوچھ لو) قرآن مجید کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے، مثلاً: 'وَھٰذَا ذِکْرٌ مُّبٰرَکٌ اَنْزَلْنٰہُ' (الانبیآء - ۲۱: ۵۰) (اور یہ بھی ایک بابرکت یاددہانی ہے جو ہم نے نازل فرمائی ہے)۔ قرآن مجید کے لیے بطریقِ صفت بھی استعمال ہوا ہے، مثلاً: 'وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ' (صٓ - ۳۸: ۱) (ذکر والے قرآن کی قسم) قرآن مجید کو 'ذکر' کے لفظ سے تعبیر کرنے سے ایک خاص حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ تعلیم الٰہی سرتاپا فطرتِ انسانی کا بیان و اظہار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام اور آسمانی صحیفوں کے ذریعہ سے جو تعلیم دی ہے وہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو انسان پر اس کے اوپر سے چپکا دی گئی ہو، بلکہ یہ خود انسان کے باطن کی صدا، اس کی روح کا نغمہ اور اس کی فطرت کا اقرار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس تعلیم کے مبادی انسان کے اندر ودیعت کر دیے تھے اور پھر انہی مبادی کو حضرات انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے آشکارا کیا۔ اسی وجہ سے اسلام کو دینِ فطرت کہا گیا ہے: 'فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا' (الروم - ۳۰: ۳) (اس دینِ فطرت کی پیروی کرو جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا) اور حضرات

انبیائے کرام کو مذکر (یاد دہانی کرنے والے) اور ان کی تعلیم و دعوت کو تذکیر و ذکریٰ (یعنی یاد دہانی) کے لفظ سے تعبیر فرمایا گیا: "فَذَكِّرْ إِن نَّفَعَتِ الذِّكْرَىٰ" (الاعلیٰ - ۸۷ : ۹) (پس یاد دہانی کرو اگر یہ یاد دہانی کچھ نفع پہنچائے) کیونکہ حقیقت میں تعلیم الٰہی یاد دہانی کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ دین و مذہب کا یہ پورا نظام انسان کے خارج سے نہیں اُگا ہے؛ بلکہ اس کا تخم اس کی فطرت کے اندر پوشیدہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے مخصوص بندوں کے ذریعے سے اس کی آبیاری کا سامان فرمایا اور وہ ایک تناور درخت بن گیا۔ جس طرح زمین نمو اور روئیدگی کے تمام خزانوں سے معمور ہے، لیکن بارش کی محتاج ہے کہ وہ نازل ہو کر اس کے ان تمام خزانوں کو ابھار کر سطح پر پھیلا دے، اسی طرح فطرتِ انسانی بھی علم و حکمت کے تمام خزانوں سے معمور ہے لیکن اس کی شادابی و زرخیزی ایک آسمانی بارش کی محتاج ہوتی ہے۔ جب وہ بارش ہو جاتی ہے تو اس کا چپہ چپہ رشکِ جنت بن جاتا ہے اور اگر یہ بارش نہ ہوتی تو انسانی فطرت ایک مردہ زمین کی مانند بن جاتی جو اخلاقی و روحانی زندگی کے آثار سے یک قلم محروم ہوتی۔ یہ آسمانی بارش اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی کتاب قرآن حکیم ہے۔

قرآن مجید کے مختلف ناموں میں سے 'تذکرۃ' اور 'نور' دو نام ایسے ہیں جو نہایت واضح طور پر اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جو اوپر بیان ہوئی ہے۔ تذکرہ کے معنی یاد دہانی کے ہیں، جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہوئے کہ قرآن مجید ہم کو جو کچھ تعلیم دیتا ہے وہ بالکل مطابقِ فطرت ہونے کی وجہ سے ایسی دل نشین ہوتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہم کو ہمارا ہی بھولا بسرا ہوا سبق یاد دلا رہا ہے۔ کوئی ایسی بات نہیں کہہ رہا ہے جو ہمارے لیے انوکھی اور اوپری ہو۔

۱ دیکھنا تقریر کی لذت، کہ جو اس نے کہا — میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔

"نور" کے معنی روشنی کے ہیں۔ روشنی اشیاء کو نمایاں کر دیتی ہے جس کے معنی دوسرے الفاظ میں یہ ہوئے کہ انسانی فطرت کے تہ بہ تہ پردوں کے اندر علم و حکمت کے جو لعل و گہر چھپے ہوئے ہیں کتابِ الٰہی کی روشنی نمودار ہو کر ان کو آنکھوں کے سامنے کر دیتی ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ "ذکر" کا لفظ نہایت اہم ہے۔ یہ تمام علم و حکمت کا سرچشمہ ہے۔ یہ لفظ اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اصلی علم کے حاصل کرنے کا راستہ یہ ہے کہ انسان ان اسباق کو یاد کرے جو اس کی فطرت کو روزِ ازل میں پڑھائے گئے ہیں، لیکن وہ ان کو بھولا ہوا ہے۔ معرفت و حکمت کے تمام اسرار اللہ تعالےٰ نے ہماری فطرت کے اندر ودیعت فرما دیے ہیں، لیکن ہم یا تو ان کو بھولے ہوئے ہیں یا وہ ہماری نگاہوں سے اوجھل ہیں۔ ان کو حاصل کرنے کا راستہ یہ ہے کہ ہم ان کو یاد کرنے اور حافظہ کے سامنے لانے کی کوشش کریں۔ اس کام میں ہماری مدد اور رہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء مبعوث فرمائے اور کتابیں نازل فرمائیں اور پھر سب سے آخر میں قرآن مجید کو اتارا جو اس مقصدِ یاد دہانی کے لیے سب سے زیادہ موزوں اور سب سے زیادہ کارآمد اور تمام کتابوں میں آخری کتاب ہے۔ اس اعتبار سے قرآنِ مجید بلاشبہ نہایت آسان کتاب ہے۔ علم و حکمت کی بلندیوں تک پہنچنے کا اس سے زیادہ سہل اور آسان راستہ کوئی دوسرا نہیں ہے۔ سب سے زیادہ مامون راہ یہی ہے۔ دوسری راہوں میں گمراہیاں ہیں، فتنے ہیں، دشوار گزار گھاٹیاں، ناقابلِ عبور سمندر ہیں، ہولناک بیابان اور صحرا ہیں مگر قرآن مجید کی راہ بالکل بے خطر ہے۔ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی کھولی ہوئی راہ یہی ہے۔ اس وجہ سے اس میں کوئی کجی نہیں ہے۔ یہ صراط مستقیم ہے۔ یہ دینِ قیم ہے اور انسانی اور شیطانی تصرفات اس کی سیدھائی کو کچھ نہیں کر سکے ہیں۔ جو اس راہ کو اختیار کرے گا وہ خدا تک پہنچے گا۔ مگر اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ

اس راہ کے رہرو کو قطعِ مسافت اور زاد و راحلہ کی تمام زحمتوں سے بھی سبکدوشی حاصل ہو جاتی ہو اور وہ بغیر ایک قدم چلے اور بغیر کوئی تکلیف اٹھائے آپ سے آپ منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہو۔ کل تک سمندروں میں بادبانی کشتیاں چلتی تھیں اور سمندر کا سفر کرنے والے جان کی بازی کھیل کر یہ سفر کرتے تھے اب ان کی جگہ دخانی جہازات نے لے لی ہے جن کی وجہ سے بحری سفر کی بے پایاں مشکلات ایک بڑی حد تک قابو میں آگئی ہیں۔ لیکن سمندر پھر بھی سمندر ہی رہا، خشکی نہیں بن گیا ہے۔ یہی حال ہماری روحانی اور اخلاقی دنیا کا بھی ہے۔ قرآن مجید کے نازل ہونے سے پہلے ہم خدا کی معرفت کے سمندر کو گویا بادبانی کشتیوں کے ذریعہ سے طے کرتے تھے اور اس سفر میں بے شمار خطرات اور بے شمار آفتوں سے دوچار ہوتے تھے، لیکن قرآن مجید کو نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے اس سمندر کے لیے وہ سفینہ بھیج دیا جو تکمیلِ کار کا بالکل آخری نمونہ ہے۔ اس نے تمام برّاعظموں کی سرحدیں ملا دیں، سمندر کی تمام ہولناکیاں مسخر کر لیں، موجوں، طوفانوں اور برف کی چٹانوں کو زیر کر لیا۔ یہ سب کچھ ہوا، لیکن سمندر پھر بھی سمندر ہی رہا، اپنے مکان کا صحن نہیں بن گیا ہے۔

پس قرآن مجید کے سہل ہونے کے معنی صرف یہ ہیں کہ اگر کوئی طالب علم اس کی رہنمائی میں حقیقت تک پہنچنا چاہے گا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی مدد ہوگی کیونکہ اس نے وہ راہ اختیار کر لی ہے جو خود اللہ کی کھولی ہوئی راہ ہے اور جس سے زیادہ سیدھی اور ہموار راہ کوئی دوسری نہیں ہے۔ حضرت مطرؒ نے 'هَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ' (القمر - ۵۴ : ۱۵) (تو ہے کوئی یاددہانی حاصل کرنے والا) کی تاویل فرماتے ہوئے مندرجہ ذیل الفاظ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے :

هل من طالب علم فيعان عليه؟[1] ہے کوئی طالب علم جس کی مدد کی جائے؟

اس حقیقت کی طرف صاحبِ کشّاف ان الفاظ میں اشارہ فرماتے ہیں :

---

[1] تفسیر ابن جریر : ج ۲۷، ص ۹۷

يجوز ان يكون المعنى: ولقد هيأناه للذكر من يسر ناقته للسفر اذا رحلها ويسر فرسه للغزو اذا اسرجه والجمه[1] ۔

یعنی اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم نے ذکر (یعنی حصول علم) کے لیے قرآن مجید کو تیار کر دیا ہے، جیسا کہ محاورہ ہے: یسّر ناقتہ للسفر ویسر فرسہ للغزو (اس نے اونٹنی کو سفر کے لیے اور گھوڑے کو میدان جنگ کے لیے تیار کیا)۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اس آیت کا عام طور پر جو مطلب لوگ لیتے ہیں اور پھر اس سے جو نتیجہ نکالتے ہیں وہ صحیح نہیں ہے۔ جس سورہ میں یہ آیت وارد ہوئی ہے، اس پر غور کرنے سے بھی وہی حقیقت سامنے آتی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ یہ آیت سورۂ قمر میں بار بار دہرائی گئی ہے۔ سورۂ قمر میں یہ مضمون بیان ہوا ہے کہ کفار وعدۂ قیامت کی تکذیب کرتے ہیں اور مطالبہ کرتے ہیں کہ اگر عذاب کو واقعی آنا ہے تو اس کی کوئی نشانی ہمارے پاس آجائے، ذرا ہم اپنی آنکھوں سے اس کو دیکھ لیں، اس کے بعد ایمان لائیں گے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس سے پہلے بہت سی قوموں نے اسی طرح عذاب کا مطالبہ کیا اور وہ ہلاک کر دی گئیں کیونکہ عذاب کی نشانی دیکھنے کے باوجود ان پر ایمان و ہدایت کی راہ نہیں کھلی۔ ایمان و ہدایت کی راہ یہ ہے کہ آدمی اپنی عقل سے کام لے۔ جب انہوں نے عقل اور سمجھ کی رہنمائی قبول کرنے سے انکار کر دیا تو ایمان و تصدیق تک پہنچنے کا کوئی راستہ ہی باقی نہیں رہا۔ عقل کو معطل کر دینے ہی کی وجہ سے انہوں نے آسمان اور زمین کی بے شمار نشانیوں کی تکذیب کی ہے، بے شمار اچنبھوں کو جھٹلا دیا ہے، لاتعداد معجزات سے آنکھیں بند کر لی ہیں، پھر کیسے ممکن ہے کہ جنہوں نے ہزاروں کا انکار کر دیا ہو وہ ایک کو مان لیں گے۔ جس خیرگی کے سبب سے انہوں

[1] الکشاف: ج ۴، ص ۳۸

نے سب کا انکار کیا، اسی خبرگی کے سبب سے وہ اس ایک کا بھی انکار کر دیں گے، اس وجہ سے آیات و معجزات کا مطالبہ بالکل فضول ہے اگر وہ ایمان لانا چاہتے ہیں اور یہ دعوہ محض مذاق اور شرارت نہیں ہے، بلکہ سچائی کے ساتھ ان کے دل کا اقرار ہے تو پھر علم اور عقل کی راہ اختیار کریں۔ علم کے حصول کے لیے ہم نے قرآن مجید کو نہایت مکمل اور موزوں بنا دیا ہے، اس میں ہر سوال کا جواب ہے، ہر شبہ کا ازالہ ہے، ہر خلش کے لیے تشفی ہے۔ بس اس کو اختیار کریں وہ ہر منزل میں رہنمائی کرے گا اور ہر عقدہ کو حل کر دے گا۔

تیسیر کے بعض پہلو:

تیسیرِ قرآن کی اصل حقیقت سمجھ لینے کے بعد اب آیئے یہ دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو علم اور معرفت حاصل کرنے کے لیے کتنے مختلف پہلوؤں سے موزوں بنایا ہے۔

۱۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی قابلِ ذکر بات قرآن مجید کا عربیٔ مبین میں نازل ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی اس خصوصیت کا ایک سے زیادہ مقامات پر ذکر فرمایا ہے: اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ قُرۡءٰنًا عَرَبِيًّا ' (یوسف - ۱۲: ۲) (ہم نے اس کو عربی قرآن بنا کر اتارا) 'كِتٰبٌ فُصِّلَتۡ اٰيٰتُهٗ قُرۡاٰنًا عَرَبِيًّا ' (حٰمٓ السجدۃ۔ ۴۱: ۳) (یہ ایسی کتاب ہے جس کی آیتوں کی تفصیل عربی قرآن کی صورت میں کی گئی ہے) 'وَهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِىٌّ مُّبِيۡنٌ' (النحل - ۱۶: ۱۰۳) (اور یہ فصیح عربی زبان ہے)۔

قرآن مجید کے اوّلین مخاطب عرب تھے، ان کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز یہ تھی کہ قرآن مجید عربی میں ہو۔ بغیر اس کے ان کے لیے قرآن مجید سے فائدہ

حاصل کرنا نہایت مشکل ہوتا۔ یہ اعتراض ہو سکتا تھا کہ قرآن مجید ان کے لیے پوری طرح نہیں کھولا گیا، کیونکہ اس کی زبان عجمی ہے اور وہ عرب ہیں، عربی اور عجمی کا کیا جوڑ: وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّ عَرَبِيٌّ (حٰمٓ السجدۃ - ۴۱ - ۴۴) (اور اگر ہم اس قرآن کو عجمی قرآن کی شکل میں اتارتے تو یہ لوگ اعتراض اٹھاتے کہ اس کی آیات کی وضاحت کیوں نہیں کی گئی! کلام عجمی اور مخاطب عربی!) اس لیے قرآن عربی میں نازل ہوا۔ پھر عربی بھی وہ عربی جو عربی مبین ہے۔ بالکل واضح اور صاف، مغلق اور پیچیدہ نہیں، جس کو ہر طبقہ بآسانی سمجھ سکے۔ محدود اور تنگ۔ نہیں، جس کے اسالیب و قواعد اور الفاظ و محاورات قبیلوں اور جماعتوں کے ساتھ مخصوص ہوں، بلکہ عربی جو فصحائے عرب کی بولی تھی، جس کو سب سمجھتے تھے اور جس کی فصاحت پر سب کا اتفاق و اجماع تھا۔ پس عربی زبان میں قرآن مجید کا اترنا عربوں کے لحاظ سے نہایت کھلی ہوئی تیسیر تھی۔ چنانچہ بعض آیات میں اس کی تصریح بھی ہے: فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا (مریم - ۱۹ - ۹۷) (پس ہم نے اس کتاب کو تمہاری زبان میں اس لیے سہل و سازگار بنایا کہ تم خدا ترسوں کو بشارت پہنچا دو اور جھگڑالو قوم کو آگاہی سنا دو)؛ فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (الدخان - ۴۴ : ۵۸) (پس ہم نے قرآن کو تمہاری زبان میں نہایت خوبی سے آراستہ کیا تاکہ وہ یاد دہانی حاصل کریں)۔

ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ یہ تیسیر عربوں کے لیے ہوئی، عجمیوں کو قرآن کے عربی زبان میں اترنے سے کیا فائدہ ہوا؟ یہ اعتراض بجا ہے۔ تیسیر کا یہ پہلو عربوں کے لیے مخصوص ہے جو قرآن مجید کے اول مخاطب تھے اور جن کو اللہ تعالیٰ نے دوسری

قوموں کی ہدایت کے لیے واسطہ بنایا تھا۔ لیکن اس مسئلہ پر ایک دوسرے پہلو سے نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کے عربی زبان میں اترنے میں ایک پہلو عمومی تیسیر کا بھی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن مجید کے لیے کسی خاص قوم پر اور کسی خاص زبان میں نازل ہونا ناگزیر تھا۔ اس کا براہِ راست تمام قوموں پر تمام زبانوں میں اترنا نہ تو ممکن ہی تھا اور نہ یہ بات مصلحتِ عالم کے مطابق ہی ہوتی۔ اسلام ایک عالمگیر وحدت کی دعوت ہے۔ اس مقصد کے لیے ضروری تھا کہ دنیا کو جو آخری پیغام دیا جائے اس کا مرکز ایک قوم، ایک مقام، ایک وجود اور ایک زبان ہو[1]۔ حکمتِ الٰہی نے قوموں میں سے بنی اسماعیل کو، مقامات میں سے مسکنِ ابراہیم کو، اشخاص میں سے محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو، زبانوں میں سے عربی مُبین کو منتخب فرمایا اور آج اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ انتخاب ایک بہترین انتخاب تھا! مذہب کے حقائق، حکمت کے نکات ورموز اور عالم غیب کے اسرار بیان کرنے کے لیے عربی زبان سے بڑھ کر اور کون زبان موزوں ہو سکتی تھی؟ اس وجہ سے قرآن کا عربی زبان میں اترنا جس طرح عربوں کے لیے رحمت تھا، اسی طرح بعض پہلوؤں سے یہ تمام عالم کے لیے رحمت ہے۔

۲۔ تیسیر کا دوسرا پہلو قرآن کا تھوڑا تھوڑا نازل ہونا ہے۔ اگر پورا قرآن مجید بیک وقت نازل ہو جاتا تو اس کی تعلیمات دلوں میں راسخ نہ ہو پاتیں۔ گہری باتیں اسی وقت دلوں میں جڑ پکڑا کرتی ہیں جبکہ وہ آہستہ آہستہ سبق سبق کر کے سیکھی جاتی ہیں۔ اس طرح وہ دل ودماغ میں پوری طرح سرایت کرتی ہیں اور ایک ایک بات

---

[1] آخری دین کے لیے کسی ایک زبان میں ہونا ضروری تھا؟ اس سوال کا جواب ہم نے اپنی کتاب 'دعوتِ دین اور اس کا طریق کار' میں دیا ہے۔

عمل میں آکر پختہ ہوتی ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے معاملہ میں ایسا ہی کیا۔ اس کو یک دفعہ نہیں نازل فرمایا، بلکہ آہستہ آہستہ، حالات کے تقاضے اور ضروریات کے مطالبہ پر نازل فرمایا اور جب کفار نے اعتراض کیا کہ قرآن مجید تورات کی طرح یک دفعہ کیوں نازل نہیں ہو جاتا، جستہ جستہ کیوں اترتا ہے تو ان کے جواب میں فرمایا:

كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ۝	ہم نے ایسا ہی کیا تاکہ اس کے ذریعے ہم تمہارے دل کو مضبوط کریں اور ہم نے اس کو تدریج و اہتمام کے ساتھ اتارا ہے۔
(الفرقان - ۲۵ : ۳۲)	

دوسرے مقام پر فرمایا:

لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ	تاکہ تم اس کو لوگوں کو ٹھہر ٹھہر کر سناؤ۔

(بنی اسرائیل - ۱۷ : ۱۰۶)

ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ حصولِ علم (ذکر) کا سب سے زیادہ صحیح اور آسان طریقہ یہی ہے اس لیے قرآن مجید نے اسی کو اختیار فرمایا۔

۳- سورۂ ہود کے شروع میں قرآن مجید کی تیسیر کے ایک نہایت اہم پہلو کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۝	یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں پہلے محکم کی گئیں پھر خدائے حکیم و خبیر کی طرف سے ان کی تفصیل کی گئی۔

(ھود - ۱۱ : ۱)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید نے ابتدا میں محکمات اور کلیاتِ دین کی تعلیم دی، اس کے بعد جزئیات کی تفصیل فرمائی۔ یہ طریقۂ تعلیم فطرتِ انسانی کے

بالکل مطابق ہے، اس لیے قرآن نے بھی اس کو اختیار فرمایا۔ مکی سورتوں میں دین کی تمام اصولی تعلیمات: توحید، رسالت، معاد وغیرہ نہایت مختصر اور جامع لفظوں میں بیان ہوئی ہیں۔ ان کی تفصیلات سے تعرض نہیں کیا گیا ہے۔ ان محکمات و کلیات کو ذہنوں میں اچھی طرح راسخ کر لینے کے بعد جزئیات کی تفصیل کی طرف توجہ فرمائی اور مدنی سورتوں میں تمام تفصیلات بیان ہوئیں۔ قرآن مجید کا یہ طریقہ اجمال و تفصیل انسانی فطرت کے بالکل مطابق اور احکامِ دین کی حکمت واضح کرنے کے لیے نہایت اعلیٰ ہے۔ اس وجہ سے یہ چیز بھی تیسیر میں داخل ہے۔

۴۔ تیسیر کا ایک نہایت اہم پہلو ایک ہی بات کو مختلف طریقوں اور پہلوؤں سے کہنا ہے تاکہ وہ بات اچھی طرح مخاطب کے ذہن نشین ہو جائے۔ قرآن مجید کی اصطلاح میں اس چیز کو 'تصریفِ آیات' کہتے ہیں۔ قرآن مجید نے اس چیز کا ایک سے زیادہ مقامات میں ذکر فرمایا ہے:

اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ○ (الانعام - ۶: ۴۶)	دیکھو، کس طرح ہم اپنی آیتیں مختلف پہلوؤں سے پیش کرتے ہیں، پھر بھی وہ اعراض کر رہے ہیں۔
اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ○ (الانعام - ۶: ۶۵)	دیکھو، کس کس طرح ہم اپنی آیتیں مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھیں۔

تصریفِ آیات کا مطلب قرآن کے تدبر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات ایک ہی بات مختلف اسلوبوں اور مختلف دلیلوں سے بیان ہوتی ہے اور ایک ہی حقیقت کو اس کے مختلف پہلوؤں سے واضح کیا جاتا ہے۔ یہ لفظ آیاتِ قرآن کے لیے تصریفِ ریاح سے لیا گیا ہے۔ تصریفِ ریاح کی حقیقت کیا ہے؟ ایک ہی ہوا

ہے، لیکن اس کے تصرّفات کی گوناگونی کی کوئی حد نہیں۔ وہ رحمت بھی ہے اور نقمت بھی۔ کبھی آہستہ چلتی ہے اور چمن میں پھولوں کو کھلاتی اور کھیتوں میں فصلوں کو پکاتی ہے۔ کبھی سموم بن کر نمودار ہوتی ہے اور چمنستانوں اور باغوں کو دشت و صحرا بنا کر چھوڑ دیتی ہے اور کبھی بادلوں کو اپنے کندھے پر لاد کر لاتی ہے جو تمام زمین کو جل تھل کر دیتے ہیں، کبھی ان کو ہنکا کر لے جاتی ہے اور ان کو ہنکا کر لے جانے ہی میں زمین والوں کے لیے خیر و برکت ہوتی ہے۔ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک اور پھر سال کے مختلف مہینوں میں نہ جانے وہ کتنے بھیس بدلتی ہے اور اس کا ہر بھیس اس کائنات کی زندگی اور نشو و نما کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ وہ کبھی گرم ہوتی ہے کبھی سرد، کبھی خشک ہوتی ہے کبھی تر، کبھی آندھی اور طوفان کی ہولناکی بن کر نمودار ہوتی ہے کبھی نسیمِ صبح کی جاں نوازی اور عطر بیزی بن کر۔ اللہ تعالیٰ نے اس تصریفِ ریاح کا مختلف مقامات میں ذکر فرمایا ہے۔ سورۂ ذاریات اور سورۂ مرسلات میں اس کے عجائبِ تصرّفات کی قسم بھی کھائی ہے۔

بعینہٖ یہی حال قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا ہے۔ بعض اوقات ایک ہی آیت اتنے گوناگوں پہلو رکھتی ہے کہ ان سب کا احاطہ ناممکن ہوتا ہے اور ایک ہی مضمون اتنی مختلف شکلوں میں نمودار ہوتا ہے کہ اس کا شمار کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اسی بات کو قرآن مجید تصریفِ آیات کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھنا چاہیے۔ سورۂ اعراف میں اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ بارش کی مثال بیان فرمائی ہے:

وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ	اور وہی ہے جو اپنے بارانِ رحمت سے پہلے ہواؤں کو خوش خبری بنا کر بھیجتا ہے۔

(الاعراف - ۷ : ۵۷)

اور بارش کی اس ایک ہی مثال سے تین مندرجہ ذیل حقیقتوں کی طرف توجہ دلائی ہے:

(د) خوف اور طمع ہر حال میں اللہ ہی کو پکارنا چاہیے۔ اس سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اس کی رحمت ہمیشہ اس کے بندوں سے قریب ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ عرصہ تک بارش نہیں ہوتی ہے۔ تمام زمین جل بھن جاتی ہے۔ آسمان کی طرف نگاہ اٹھایئے تو بارش کا کوئی نشان نہیں ملتا، لیکن دفعتہً کسی کونے سے ابر کا کوئی ٹکڑا نمودار ہوتا ہے اور آناً فاناً ہر طرف جل تھل ہو جاتا ہے اور مایوسیاں امید سے بدل جاتی ہیں: وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّ طَمَعًا ۭ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ۔ (الاعراف - ۷ : ۵۶) (اور اسی کو پکارو بیم و رجا، دونوں حالتوں میں، بے شک اللہ کی رحمت نیکوکاروں سے قریب ہے)

(ب) منکرین قیامت کو تعجب ہے کہ یہ کیسے ہوگا کہ جب لوگ سڑ گل جائیں گے تو قبروں سے جی اٹھیں گے، حالانکہ اس پر ذرا بھی تعجب نہ ہونا چاہیے۔ اس کا مشاہدہ ہم برابر کرتے رہتے ہیں۔ تمام زمین جل گئی ہے۔ گھاس کا ایک تنکا بھی کسی گوشہ میں نظر نہیں آرہا ہے کہ دفعتہً بارش ہوتی ہے اور چند دنوں کے اندر دیکھتے ہیں کہ تمام سطح زمین پر سبزہ کی بانات بچھ گئی ہے: سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَاۗءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۭ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى (الاعراف - ۷ : ۵۷) (ہم اس کو ہانکتے ہیں کسی بے آب و گیاہ زمین کی طرف اور وہاں پانی برساتے ہیں اور پھر ہم اس سے پیدا کرتے ہیں ہر قسم کے پھل، اسی طرح ہم مردوں کو اٹھا کھڑا کریں گے)۔

(ج) بارش زمین کے ہر حصّہ پر ہوتی ہے لیکن اس کے نتائج و اثرات ہر جگہ یکساں نہیں ہوتے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو زمینیں زرخیز تھیں ان میں یا تو کوئی چیز اُگی ہی نہیں، اور اگر اُگی بھی تو وہ چیز نہیں جس کا انسان پھل کھائے، بلکہ وہ چیز جس سے آزار اٹھائے۔ یہی حال آسمان کی روحانی بارش کا ہے۔

زمین کے موسموں کی طرح اس کا بھی ایک موسم آتا ہے اور اس موسم میں خدا آسمان سے ہدایت نازل فرماتا ہے۔ جس کا پیام یوں تو تمام انسانوں کے لیے عام ہوتا ہے، لیکن فیض بقدرِ استعداد پہنچتا ہے۔ جو فطرت صالح ہوتی ہے وہ تو اس بارش سے نمو اور برکت حاصل کرتی ہے، لیکن جو فاسد ہوتی ہے اس بارش سے اس کا فسادی ہیجان میں آجاتا ہے: وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۖ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا (الاعراف - ۷ : ۵۸) (اور زرخیز زمین کی پیداوار تو خوب اپجتی ہے اس کے رب کے حکم سے، پر جو زمین ناقص ہوتی ہے اس کی پیداوار کم ہی ہوتی ہے!)

دیکھیے بارش کی ایک ہی مثال سے کیا کیا حقیقتیں روشنی میں آئی ہیں۔ ان سب نتائج کی طرف اشارہ کرنے کے بعد فرمایا: كَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَشْكُرُونَ (الاعراف - ۷ : ۵۸) (اسی طرح ہم اپنی آیات مختلف پہلوؤں سے دکھاتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو شکرگزار بننا چاہیں)۔ اس تصریف کو تعلیم یا تیسیر قرآن میں جس قدر دخل ہو سکتا ہے وہ اس قدر واضح ہے کہ اس پر کسی بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ اس تصریف کا مقصد خود قرآن مجید کی تصریحات کے مطابق یہ ہے کہ لوگ یاددہانی کریں اور سمجھیں: وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ لِيَذَّكَّرُوا وَمَا يَزِيدُهُمْ إِلَّا نُفُورًا (بنی اسرآئیل - ۱۷ : ۴۱) (اور ہم نے اس قرآن میں گوناگوں اسلوبوں سے بات واضح کر دی کہ وہ یاددہانی حاصل کریں، لیکن یہ چیز ان کی بیزاری ہی میں اضافہ کیے جا رہی ہے)۔ انْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ (الانعام - ۶ : ۶۵) (دیکھو کس کس طرح ہم اپنی آیتیں مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھیں)۔

تیسیرِ قرآن کے یہ چند نمایاں پہلو بیان ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت

سی باتیں ہیں جو قرآن سے استنباط کر کے اس ذیل میں بیان کی جا سکتی ہیں، لیکن اس سے زیادہ تفصیل کے لیے یہ جگہ موزوں نہیں ہے۔

اس سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی ہے کہ آیتِ تیسیر کا جو مطلب عام طور پر سمجھا جاتا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ اقلیدس اور ریاضی کی کسی کتاب کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ یہ کتاب اقلیدس اور ریاضی سیکھنے کے لیے نہایت آسان ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہوں گے کہ فنِ اقلیدس اور ریاضی میں اب سرے سے کوئی مشکل ہی باقی نہیں رہ گئی ہے، بلکہ یہ مطلب ہوگا کہ ان فنون کی تعلیم کے لیے جو بہتر سے بہتر اسلوب اور طریقے اختیار کیے جا سکتے ہیں یہ کتاب ان تمام اسلوبوں اور ان تمام طریقوں سے مزیّن ہے۔ اسی طرح قرآن مجید کے متعلق جو یہ بات کہی گئی ہے کہ وہ ذکر یعنی حصولِ علم اور یاد دہانی کے لیے نہایت آسان ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ علمِ دین فکر و تدبّر کی تمام کاوشوں سے مستغنی ہو گیا ہے، بلکہ یہ مطلب ہے کہ اس عظیم الشان علم کے حصول کے لیے ایک ایسی کتاب نازل ہو گئی ہے جو بہتر سے بہتر طریقہ پر خدا کے بندوں کو خدا کے دین کے حقائق سکھاتی ہے۔

قرآن مجید کے متعلق پچھلے صفحات میں ہم نے جو خیالات ظاہر کیے ہیں وہ درحقیقت استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے چند اجمالی اشارات کی تفصیل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اب ہم ذیل میں مولانا کے خیالات خود ان کے الفاظ میں پیش کیے دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

(۱) قرآن پاک ایک ایسا کلام ہے کہ اسے نہایت کھلا اور آسان بھی کہہ سکتے ہیں اور نہایت چھپا اور مشکل بھی۔... خدائے پاک کو دیکھو کہ ہم سب اسے جانتے ہیں اور پھر کوئی بھی نہیں جانتا۔ خود اپنے آپ کو سوچو کہ اور کسی چیز میں شک ہو تو ہو اپنی ہستی میں کبھی شک نہیں مگر پھر دیکھو تو بقول غالب: ؎

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی!

قرآن خود بھی اپنے تئیں کھلا اور آسان بتاتا ہے، مگر دوسرے لحاظ سے مستور عمیق ۔ اسی طرح خدائے پاک کی نسبت کہتا ہے کہ وہ ظاہر بھی ہے اور باطن بھی ۔

(۲) ظاہر ہے کہ دو متناقض باتیں اگر ایک ہی جگہ پائی جاتی ہیں تو ضرور یہ اجتماع النقیضین دو مختلف پہلوؤں سے ہوگا۔ پس قرآن پاک کا آسان اور مشکل، دونوں ہونا ضرور دو حیثیت سے ضروری ہوگا ۔ چنانچہ ضروری اور عام تعلیم کے لحاظ سے وہ نہایت آسان ہے مگر اعلیٰ تعلیم اور دقیق مضامین کے لحاظ سے نہایت مشکل ہے اور یہی مناسب ہے کیونکہ جو لوگ اعلیٰ ترقی کی لیاقت تک نہیں پہنچے ان کے لیے وہ مضامین اگر ظاہر بھی کردیے جائیں تو بھی نہ تو وہ اسے سمجھیں گے اور نہ اس سے فائدہ اٹھائیں گے بلکہ ان کے فائدہ اٹھانے کی قابلیت کو بھی نقصان پہنچے گا ، یہ اس لیے کہ دین کا راستہ سیر باطن ہے سیرِ باطن تفکر اور تدبر سے ہوتی ہے اگر کسی شخص کو وہ باتیں جو وہ غور و فکر سے حاصل کرسکتا ہے پہلے ہی بتا دی جائیں تو اس کی قوتِ فکر ضائع ہو جائے گی اور اس بتائی ہوئی بات کو بھی اس تیقّن کے ساتھ نہ سمجھے گا جیسا کہ چاہیے اور آئندہ کی ترقی سے محروم رہے گا - اسی لیے خدائے تعالیٰ نے نظامِ عالم میں کوشش کو ضروری قرار دیا تاکہ انسان اپنی اعلیٰ ترقی تک پہنچ سکے۔ تعلیم میں اس پہلو کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے ورنہ تعلیم ایک لفظِ بے معنیٰ ہوگا کیونکہ قوائے عقلیہ کے بے کار ہونے سے وہ علم بے ثمر ہوگا - یہ بات تو علمِ ظاہری کی ہے ۔ علمِ باطنی کو اس سے کچھ زیادہ خیال کرلو ۔ کیونکہ اس

میں جاننا اسی کا نام ہے جس کو ہونا کہتے ہیں۔ اچھی اور بری کو جاننا اور پھر رغبت اور نفرت کا نہ پیدا ہونا یہ جاننا دین میں معتبر نہیں۔ حکیم بھی اگر محض نام کا حکیم نہیں تو ایسا ہی سمجھتا ہے۔ سقراط، سرآمد حکمائے یونان کا یہی مذہب تھا اور وہ گناہ اور جہل کو ہم معنی کہتا ہے۔

(۳) پس عام حکمتِ الٰہی کے موافق جس پر مدارِ ترقیٔ انسانی ہے قرآن کو محلِ تدبر اور تفکر بتایا گیا اور ظاہر کو باطن کی طرف متوجہ کیا گیا۔ خداوند تعالیٰ ہم کو ابتدائی نعمتیں عطا کر کے انتہائی نعمتوں کی طرف رہبری کرتا ہے اور جوں جوں ہم کوشش کرتے جاتے ہیں انعام کے مستحق ہوتے جاتے ہیں اور یہی عدل ہے ورنہ کیوں فرقِ مراتب ہے؟ پس اسی طرح فہمِ قرآن میں جوں جوں انسان ترقی کرتا جائے گا اس پر اسرار کھلتے جائیں گے اور ایسے نمایاں طور پر کہ وہ ان کے سمجھنے اور ماننے پر مجبور ہوگا۔ پس درحقیقت یہ کہنا ٹھیک ہوگا کہ قرآن اپنے دقیق مضامین کے لحاظ سے بھی صاف اور آسان ہے اور اس کا چھپا ہونا محض اس بات کی خبر دیتا ہے کہ ابھی ہم پیچھے ہیں۔ چنانچہ خود قرآن ہم کو بتاتا ہے کہ جو لوگ روشنی قبول کرتے ہیں خدا ان کی روشنی زیادہ کرتا ہے۔ عام تعلیم میں بھی یہ بات نظر آتی ہے۔ کیسی ہی صاف تحریر ہو ابجد خواں کے لیے وہ پیچیدہ ہے مگر ایک ماہر کے نزدیک اس کو پیچیدہ کہنا صریح ظلم ہوگا۔ قرآن نے اپنی اس صفت کو کہ وہ ایک عمیق اور مکنون کلام ہے خود بتا دیا ہے۔ پیشانی کتاب پر تین حرف ایسے لکھ دیے کہ جن کے معنی باوجود اس قدر کوشش کے اب تک ظاہر نہ ہوئے گویا کہ اس معنوی راہ کے اوّل ہی قدم پر یہ کتابہ لگا دیا گیا ہے؛ ع

ہشدار کہ رہ بردمِ تیغ است قدم را

اور نہ صرف اوّل میں، بلکہ اور بھی جا بجا منزلوں کے سرے پر ایسا کتابہ

آویزاں کر دیا کہ مبادا اگر راہگیر ایک جگہ بھول گیا تو دوسری جگہ ضرور خیال کرے۔

(۴) پس قرآن نے صاف طرح پر اعلان کر دیا، اس دریا سے بقدر اپنے ظرف کے پانی لے لو۔ تمام دریا کو اپنی کلھیا میں بھرنے کی ہوس نہ کرو صحابہؓ اس نکتہ کو خوب سمجھتے تھے۔ اگر کسی جگہ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو خواہ مخواہ اس میں الجھتے نہ تھے۔ یہ اس لیے تھا کہ بقدرِ ہدایت قرآن نہایت کھلا تھا، دریا سے عبور کر کے اپنی منزلِ مقصود کو پہنچتے تھے مگر اس کی تمام وسعت کو ناپنے کی تمنا نہیں کرتے تھے کیونکہ وہ اسے غیر محدود اور ناپیداکنار جان گئے تھے۔ ہاں ہر شخص بقدر اپنے فہم اور قوتِ فکر کے اس سے جواہر لکالتا تھا اور عام شاہراہ سے ادھر ادھر جو دلکش جزیرے واقع تھے اس کا انکشاف کرتا تھا جیسا کہ حضرت علیؓ سے منقول ہے: "اس دریا کے عجائب کبھی ختم نہ ہوں گے۔"

(۵) جو لوگ قرآن کو ایک معمولی کلام خیال کرتے ہیں اور اپنی لیاقت کو جتنی ہے اس سے زیادہ سمجھ کر سمجھتے ہیں کہ یہ فہمِ قرآن کے لیے کافی ہے وہ قرآن کے معنی سے بالکل محروم رہتے ہیں۔ ان میں بعض اپنی کج فہمی کا نام اعتراض رکھتے ہیں۔ دوسرے مذاہب والے جو قرآن کو کچھ تھوڑا بہت سمجھتے ہیں وہ خود گواہی دیتے ہیں کہ اس کو سمجھنے کے لیے یہ پہلا امر ہے کہ اسے ایک اعلیٰ کلام مانا جائے۔ قرآن پاک نے بھی اپنی نسبت مختلف جگہ یہی کہا ہے کہ انکار کرنے والا اس کو ہرگز نہیں سمجھے گا۔ عیسیٰ علیہ السلام سے جب ان کے شاگرد نے پوچھا کہ آپ بذریعہ تشبیہات کیوں تعلیم دیتے ہیں تو یہی فرمایا: "میں ان سے تمثیلوں میں اس لیے باتیں کرتا ہوں کہ وہ دیکھتے ہوئے نہیں دیکھتے اور سنتے ہوئے نہیں سنتے اور نہیں سمجھتے۔" قرآن اپنی نسبت کہتا

ہے کہ "اس سے بدکاروں کی گمراہی اور بڑھ جاتی ہے"۔ چنانچہ ہمیشہ ایسا ہوتا رہا کہ حق کو جب ظاہر کیا گیا ہے تو وہ لوگ جو حق کے ماننے کے لیے آمادہ تھے انہوں نے بے تکلف اسے مان لیا اور حق کے راستہ پر چل کھڑے ہوئے اور آگے بڑھ گئے۔ جس نے پس و پیش کیا اس نے اپنی منزل کھوئی اور جس نے منہ پھیر لیا وہ اندھا ہو گیا۔ کیونکہ جس عقل کو وہ ہر کام میں اپنا رہنما بناتا تھا جب اسی عقل نے حق کی گواہی دی تو وہ اس سے بیزار ہوا اور کہنے لگا کہ اس کلام میں جادو ہے کہ میری سمجھ الٹی ہوئی جاتی ہے۔ پس عقل پر خواہش کو مقدم رکھا اور لگا فضول شبہے اور بے کار حیلے ڈھونڈنے تاکہ اپنی حماقت پر ذرا پردہ ڈال دے کیونکہ فطرت کو تاریکی سے خود نفرت ہے۔ پس جب اس نے اس طرح عقل کی آنکھ پر پٹی باندھ لی تو ظاہر ہے کہ جو کچھ رہی سہی روشنی تھی اسے بھی کھو بیٹھا۔ اس حالت کو قرآن پاک نے اکثر جگہ بیان کیا ہے اور انجیل میں بھی اس طرف اشارہ ہے[1]۔

قرآن مجید کی مشکلات باعتبار مخاطب:

مضمون کے شروع میں ہم لکھ چکے ہیں کہ ایک کلام ایک شخص کے لیے نہایت سہل و آسان ہوتا ہے، لیکن وہی کلام دوسرے شخص کے لیے مشکل ہوتا ہے قرآن مجید کے معاملہ پر اس پہلو سے بھی غور کرنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ عہدِ رسالت کے مسلمانوں کے لیے قرآن مجید نہایت آسان تھا۔ وہ آسانیاں بعد کے لوگوں کے لیے باقی نہیں رہیں۔ اپنے ماحول کے احوال و واقعات، اپنے زمانہ کے رسوم و عادات اور اپنی

---

[1] تفاسیرِ فراہی: دیباچہ تفسیر سورۃ اخلاص

قوم کے اعمال و عقائد سے وہ پوری طرح باخبر تھے۔ قرآن مجید نے جہاں اشارہ کیا فوراً سمجھ گئے۔ یہاں تک کہ اُن آیات کا سمجھنا بھی ان کے لیے کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا جن میں کسی خاص واقعہ یا کسی شخص کی طرف نہایت مخفی اور لطیف تعریضات ہوتی تھیں۔ کوئی آیت اتری اور اس کے کسی لفظ میں انہوں نے کسی خاص اشارہ یا تعریض یا کنایہ کی بو پائی اور فوراً اس کے صحیح مصداق کی طرف انگلیاں اٹھا دیں اور حرفِ مطلب تک اس طرح پہنچ گئے گویا اخفاء و ابہام کے قسم کی کوئی بات تھی ہی نہیں۔ اس کو مثال سے یوں سمجھیے کہ قرآن مجید میں بہت سی آیات ہیں جن میں ابولہب کی نسبت نہایت لطیف تعریضات ہیں۔ ان آیات کے اندر جو شخصیت مخفی ہے اس کی طرف صحابہؓ کی نظر جس آسانی کے ساتھ اٹھ سکتی تھی اس آسانی کے ساتھ ہماری نظر نہیں اٹھ سکتی۔ وہ اس کے خدّ و خال سے اچھی طرح آشنا تھے اس وجہ سے جوں ہی لسانِ غیب سے کوئی لفظ تراوش ہوا وہ بے تکلف اس کا مطلب سمجھ گئے۔ بعض آیات میں صحابہؓ میں سے کسی خاص شخص کی مدح یا کسی کے کسی خاص فعل پر مذمت ہے، ان کو جس سہولت کے ساتھ عہدِ نزولِ قرآن کے لوگ پہچان سکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس سہولت کے ساتھ بعد کی صدیوں کے لوگ نہیں پہچان سکتے تھے۔

یہی حال اعمال و عقائد کا ہے۔ قرآن میں اس عہد کے اعمال و عقائد کے بیان سے شاید ہی کوئی سورہ خالی ہو لیکن جس طرح معلوم و مشہور باتیں بیان ہوتی ہیں اسی طرح بالاجمال ان کی طرف اشارات کر دیے گئے ہیں، تفصیل کا اسلوب اختیار نہیں کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۃ انعام میں اہلِ عرب کے بعض اعمال و معتقدات اس طرح بیان ہوئے ہیں:

وَجَعَلُوا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ	اور خدا نے جو کھیتی اور چوپائے پیدا
الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا	کیے اس میں انہوں نے اللہ کا ایک حصہ

هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا
لِشُرَكَآئِنَا فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ
فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ وَمَا كَانَ
لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ
سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝ وَكَذٰلِكَ
زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ
اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَ
لِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ط
وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ
وَمَا يَفْتَرُوْنَ ۝ وَقَالُوْا هٰذِهٖٓ
اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ق
لَّا يَطْعَمُهَا اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ
بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ
ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ
اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً
عَلَيْهِ ط سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا
كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝ وَقَالُوْا مَا
فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ
خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ
عَلٰٓى اَزْوَاجِنَا ج وَاِنْ يَّكُنْ
مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ

مقرر کیا ہے۔ پس کہتے ہیں: یہ حصہ تو اللہ
کا ہے، ان کے گمان کے مطابق، اور
یہ حصہ ہمارے شرکاء کا ہے۔ تو جو حصہ ان
کے شرکاء کا ہوتا ہے وہ تو اللہ کو نہیں
پہنچ سکتا اور جو حصہ اللہ کا ہوتا ہے وہ ان
کے شرکاء کو پہنچ سکتا ہے کیا ہی برا فیصلہ
ہے جو یہ کرتے ہیں۔ اور اسی طرح بہت سے
مشرکوں کی نظر میں ان کے شرکاء نے ان کی
اولاد کے قتل کو ایک مستحسن فعل بنا دیا ہے
تا کہ ان کو تباہ کریں اور تا کہ ان کے دین
کو ان کے لیے بالکل گھپلا کر دیں اور اگر
اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کر پاتے تو ان کو
چھوڑ دو۔ اپنے اسی افتراء میں پڑے رہیں
اور کہتے ہیں: فلاں فلاں چوپائے اور
فلاں فلاں کھیتی ممنوع ہے، ان کو نہیں کھا
سکتے مگر وہی جن کو ہم چاہیں، اپنے گمان کے
مطابق۔ اور کچھ چوپائے ہیں جن کی پیٹھیں
حرام ٹھہرائی گئی ہیں اور کچھ چوپائے ہیں
جن پر خدا کا نام نہیں لیتے، محض اللہ
پر افتراء کے طور پر۔ اللہ عنقریب ان
کو اس افتراء کا بدلہ دے گا اور کہتے

۱؎ انجیل متی - باب ۱۳ : ۱۳

سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ ط إِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ○ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ط قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ○

(الانعام - ٦ : ١٣٦ - ١٤٠)

ہیں: فلاں قسم کے چوپایوں کے پیٹ میں جو ہے وہ بس ہمارے مردوں کے لیے خاص ہے اور ہماری عورتوں کے لیے حرام ہے اور اگر وہ مردہ ہو تو اس میں سب شریک ہیں۔ عنقریب اللہ ان کو ان کی اس تشخیص کی سزا دے گا۔ بے شک وہ حکیم و علیم ہے۔ وہ لوگ نامراد ہوئے جنہوں نے محض بے وقوفی سے، بغیر کسی علم کے، اپنی اولاد کو قتل کیا اور اللہ نے ان کو جو روزی بخشی اس کو اللہ پر افتراء کر کے حرام ٹھہرایا۔ یہ گمراہ ہوئے اور ہدایت پانے والے نہ بنے

ان آیات کے اندر اہل عرب کے متعدد توہمات بیان ہوئے ہیں اور اندازِ بیان اجمالی اشارات کا ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو یہ داستان سنائی جا رہی ہے وہ اس سے پوری طرح باخبر ہیں۔ پس اقتضائے بلاغت یہی تھا کہ اس کی تفصیل نہ کی جائے۔ لیکن بعد والوں کے لیے، جو اس عہد کے خاتمہ کے بعد آئے، ان اجمالی اشارات کا سمجھنا آسان نہیں ہے۔ ان کے ذہن میں ان کی تفصیلات سے متعلق بہت سے سوالات پیدا ہوں گے جن کے جواب کے لیے اس عہد کے عقائد و اعمال سے واقفیت ضروری ہے۔

اس کو ایک دوسری مثال سے بھی سمجھیے۔ سورۂ انفال میں فرمایا ہے کہ: وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً ' (الانفال - ٨ : ٣٥) (اور بیت اللہ کے سامنے ان کی نماز سیٹی بجانے اور تالی پیٹنے کے سوا کچھ نہیں)۔ آج

ہمارے لیے اہلِ مکّہ کی اس عبادت کا صحیح تصوّر کتنا مشکل ہے لیکن عہدِ نزولِ قرآن کے لوگوں کے لیے اس سے زیادہ عام اور معلوم بات کوئی دوسری نہیں ہوسکتی تھی، وہ نہ صرف اس نماز کی پوری ہیئت و حقیقت سے واقف تھے، بلکہ ظہورِ اسلام سے پہلے یہی نمازیں خود پڑھتے رہے تھے۔

ایک اور مثال لیجیے۔ سورۂ اعراف میں ہے:

وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا	اور جب یہ لوگ کسی بے حیائی کا ارتکاب
وَجَدْنَا عَلَيْهَا اٰبَآءَنَا	کرتے ہیں، کہتے ہیں: ہم نے تو اس طریق
وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ط قُلْ	پر اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور خدا نے
اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ	ہمیں اسی کا حکم دیا ہے۔ کہہ دو: اللہ
بِالْفَحْشَآءِ ط اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى	کبھی بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔ کیا تم
اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ہ	لوگ اللہ پر وہ تہمت جوڑتے ہو جس
(الاعراف - ۷ : ۲۸)	کے باب میں تم کو کوئی علم نہیں۔

جو لوگ عہدِ نزولِ قرآن میں موجود تھے انہوں نے اس آیت کو اہلِ مکہ کے ننگے ہو کر طواف کرنے سے متعلق سمجھا، حالانکہ اس میں ننگے ہو کر طواف کرنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک لطیف اشارہ ہے۔ لیکن کلام کا موقع اور سیاق و سباق ایسا تھا کہ جو لوگ اہلِ مکّہ کی اس حالت سے واقف تھے، ان کا ذہن اس مطلب کی طرف جا سکتا تھا۔ البتہ بعد والوں کو یہ مطلب سمجھنے میں زحمتیں پیش آئیں، اس لیے کہ ان کے سامنے صرف کلام اور اس کا سیاق و سباق تھا وہ موقع اور ماحول نہ تھا جس میں یہ کلام نازل ہوا تھا۔ ہرچند کہ الفاظ اور سیاقِ کلام صحیح مطلب کی طرف رہنمائی کرنے کے لیے ناکافی نہیں ہوتے، لیکن ان کی رہنمائی کے ساتھ اگر موقع و محل کی رہنمائی بھی شامل ہو جائے تو پھر اصل حقیقت آپ

سے آپ بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

اسی آیت سے بالکل متصل فرمایا ہے:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ	اے بنی آدم! ہر مسجد کی حاضری کے وقت اپنے لباس پہنو اور کھاؤ، پیو، البتہ اسراف نہ کرو، خدا اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ پوچھو کس نے حرام ٹھہرایا ہے اللہ کی اس زینت کو جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی اور رزق کی پاکیزہ چیزوں کو؟

(الاعراف - ۷: ۳۱-۳۲)

یہ آیت بھی مذکورہ بالا مسئلہ ہی سے متعلق ہے۔ اس سے ننگے طواف کرنے کا اصلی فلسفہ معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ عرب کا یہ احمقانہ فعل، ان کے بہت سے افعال کی طرح، درحقیقت ایک نیکی پر مبنی تھا۔ یہ بے حیائی انھوں نے اس لیے اختیار کی تھی کہ وہ اس کو رہبانیت اور زہد خیال کرتے تھے۔ ان کے خیال میں لباس ایک شان و تجمّل اور زیب و زینت کی چیز ہے اس لیے وہ طواف کے وقت اس کو اتار دیتے تھے کہ خدا کے گھر کا طواف ان دنیاوی آلائشوں کی آلودگی سے پاک رہے۔ قرآن مجید نے مذکورہ آیت میں ان کے اس خیال کی تردید کی کہ نیکی کا یہ تصوّر بالکل غلط ہے کہ جو نعمتیں اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں ان کو آدمی اپنے اوپر حرام کر لے۔ ان نعمتوں سے متمتّع ہونا چاہیے، کیونکہ ان کے وجود میں لانے کا منشا ہی یہی ہے کہ خدا کے بندے ان سے متمتّع ہوں۔ البتہ اسراف ناجائز ہے اس سے بچنا چاہیے۔

ظاہر ہے کہ اس آیت کے صحیح زور کو سمجھنا، اس امر پر منحصر ہے کہ طوافِ عریاں کا یہ فلسفہ سامنے ہو۔ یہ فلسفہ آیت کے الفاظ سے اگرچہ مترشح ہو رہا ہے، بلکہ بغیر اس کو مانے ہوئے آیت کی کوئی جمتی ہوئی تاویل ناممکن ہے، لیکن الفاظ میں اس قدر عموم ہے کہ اگر یہ بات سامنے نہ ہو اور موقع کلام اس کی طرف رہبری نہ کرے تو اس مطلب تک پہنچنے میں دقتیں پیش آئیں گی۔ لیکن جن کے سامنے یہ فعل اور یہ فلسفہ دونوں موجود تھے ان کو اس آیت کے سمجھنے میں کیا دقت ہو سکتی تھی! خود اپنی حکایت تھی، ادھر الفاظ زبان سے نکلے ادھر تمام حقیقت آئینہ ہو کر سامنے آ گئی۔

اسی طرح سورۂ بقرہ میں، جہاں احکامِ حج بیان ہوئے ہیں، فرمایا ہے:

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ	پھر جب تم حج کے مناسک ادا کر چکو
فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ	تو اللہ کو یاد کرو، جس طرح تم پہلے
اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ط	اپنے باپ دادا کو یاد کرتے رہے ہو بلکہ اس
(البقرة - ۲ : ۲۰۰)	سے بھی بڑھ چڑھ کر۔

سلف سے اس آیت کی جو تاویل ہم تک پہنچی ہے اس میں 'كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ' کی تفصیل میں وہ فرماتے ہیں:

وکانوا اذا قضوا مناسکھم	مناسکِ حج سے فارغ ہو کر لوگ مسجد
وقفوا بین المسجد بمنی	اور پہاڑ کے درمیان بیٹھ جاتے اور اپنے
وبین الجبل فیعدون	آباء و اجداد کے مفاخر اور کارنامے
فضائل اٰباءھم ویذکرون	بیان کرتے۔

محاسن ایاھم۔

اگرچہ آیت کے الفاظ مذکورہ بالا تفصیل کی طرف اشارہ کر رہے ہیں، لیکن اس اشارہ کو سمجھنا ان لوگوں کے لیے بہت آسان نہیں ہے جو موقع کی اس خصوصیت

اور عرب کے مذاق سے پوری طرح واقف نہیں ہیں۔ البتہ جو لوگ عہدِ نزولِ قرآن میں موجود اور ان حالات سے باخبر تھے ان کے لیے اس کا سمجھ لینا کچھ مشکل نہیں تھا۔

اسی طرح کسی عہد کا کلام اس عہد کی بے شمار تمدّنی، سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے اور اس کا اصلی حسن اور اصلی زور اس وقت تک سمجھ میں نہیں آتا جب تک اس کلام کا ماحول اپنے اردگرد نہ پیدا کر لیا جائے۔ مثلاً ایک مقام پر فرمایا ہے:

اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ	تم نے اللہ کے سوا جو بت بنائے ہیں،
مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ	تمہاری آپس کی دوستی بس دنیا کی زندگی
ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ	تک ہے۔ پھر قیامت کے دن تم میں سے
بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۡ	ہر ایک دوسرے کا انکار کرے گا اور ایک
وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ	دوسرے پر لعنت کرے گا اور تمہارا ٹھکانا
مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۙ	دوزخ ہوگا اور تمہارا کوئی مددگار نہیں ہوگا

(العنکبوت - ۲۹ : ۲۵)

اس آیت میں 'مَوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا' کے ٹکڑے پر غور کیجیے۔ اس میں اس عہد کی سیاست کی ایک بنیادی حقیقت کی طرف اشارہ ہے جس کے سمجھے بغیر آیت کی صحیح تاویل کے بعض نہایت اہم پہلو بے نقاب نہیں ہوتے۔

عرب اور دوسری بہت سی بت پرست اقوام میں بت پرستی محض ایک مذہبی عمل و اعتقاد ہی کی حیثیت سے نہیں تھی، بلکہ ان کے تمام سیاسی اور اجتماعی رشتے بھی اسی چیز سے وابستہ تھے۔ قبیلہ قبیلہ کے الگ الگ اصنام تھے اور دستور تھا کہ جب کوئی قبیلہ کسی دوسرے قبیلہ کے ساتھ اتحاد کرنا چاہتا تو اس کے بت کی پرستش میں اس کے ساتھ شریک ہو جاتا اور جب اس سے قطعِ تعلق کرنا چاہتا اس شرکت سے

علیحدگی کا اعلان کر دیتا، اس کے بعد آپس کے تمام سیاسی تعلقات ختم ہو جاتے۔ غور کیجیے جن لوگوں کے سامنے یہ حقیقت موجود تھی ان کو آیت کے اس ٹکڑے کے سمجھنے میں کیا دقت پیش آسکتی تھی، سنا اور فوراً سمجھ گئے۔ لیکن ہم جب تک اس عہد کی سیاسیات سے فی الجملہ واقف نہ ہوں، ان لفظوں کا حقیقی زور کس طرح سمجھ سکتے ہیں۔

اس حقیقت کی توضیح کے لیے ایک عمدہ مثال سورۂ بقرہ کی وہ آیت بھی ہے جو شراب اور جوئے کی ممانعت سے متعلق ہے :

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ	وہ تم سے شراب اور جوئے کے متعلق سوال
قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ	کرتے ہیں، کہہ دو: ان دونوں چیزوں کے
مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ	اندر بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے کچھ
اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ	فائدے بھی ہیں، لیکن ان کا گناہ ان کے
(البقرۃ - ۲ : ۲۱۹)	فائدے سے بڑھ کر ہے۔

اس آیت کی نسبت ایک غلط فہمی بہت عام ہے لوگ سمجھتے ہیں کہ خمر و میسر کی جس منفعت کا قرآن نے اعتراف کیا ہے وہ ان کی طبّی اور ذاتی منفعت ہے، حالانکہ یہ بات کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتی۔ قرآن نے جس منفعت کا اعتراف کیا ہے وہ ان کی تمدنی، اخلاقی اور معاشرتی منفعت ہے کیسی چیز کی طبّی اور ذاتی منفعت اوّلاً تو قرآن کے دائرہ بحث سے خارج ہے۔ ثانیاً اگر شراب میں کچھ فائدہ ہوں بھی تو دنیا کی کونسی مضر سے مضر شے ایسی ہے جس میں کوئی پہلو فائدہ کا نہیں ہے، پھر شراب اور جوئے ہی کی کیا خصوصیت تھی کہ قرآن نے ان کو حرام کرتے ہوئے ان کے نفع بخش اور مفید ہونے کا اعتراف کیا۔ دوسری بہت سی چیزیں حرام کیں، کیا وہ فوائد سے مطلقاً خالی تھیں؟ پھر ان کی نسبت یہ اعتراف کیوں نہیں کیا؟ کیا سوّر میں کوئی فائدہ کا پہلو نہیں تھا؟

ہمارے نزدیک یہ خیال بالکل غلط ہے اور اس غلطی کو رفع کرنے کے لیے آیت میں 'نفع' اور 'اثم' کا تقابل بالکل کافی ہے۔ اگر مقصود ان کے طبّی اور ذاتی فوائد و نقصانات کی طرف اشارہ کرنا ہوتا تو 'نفع' کے مقابل میں ضرر یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ آتا 'اثم' کا لفظ نہ آتا جو عربی زبان میں جسمانی ضرر کے مفہوم کے لیے نہیں بلکہ اخلاقی گناہ کے لیے بولا جاتا ہے۔

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ شراب اور جوئے کے طبّی و ذاتی منافع کا معاملہ تو آسان تھا کہ اس کے بعض پہلو معلوم تھے، لیکن ان کے تمدنی اور اخلاقی فوائد کیا ہیں جن کا قرآن نے اعتراف کیا ہے؟ اس سوال کا جو صحیح جواب ہے اس کا باور کرنا آج کل کے لوگوں کے لیے مشکل ہے کیونکہ ہمارے سامنے جوے خواری اور قمار بازی ہے وہ سرتاسر ضرر و فساد ہی ہے، اس میں فائدہ کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی نہیں ہے۔ وہ جسم اور روح، فرد اور سماج، سب کے لیے یکساں لعنت ہے۔ البتہ عربوں میں مے خواری اور قمار بازی کو تمدنی اور اخلاقی اعتبار سے ایک خاص اہمیت حاصل تھی۔ ان کی سوسائٹی میں یہ دونوں برائیاں نیکی کی راہ سے داخل ہوئی تھیں۔ وہ ان دونوں چیزوں کو فیاضی اور کرم گستری کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھتے تھے اس لیے ان لوگوں کو نہایت نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے جو شراب اور جوئے سے بچتے تھے۔ جو لوگ اس عہد کی تہذیب سے واقف ہیں وہ ہمارے اس بیان کا انکار نہیں کر سکتے۔ کسی جاہلی شاعر کے چند شعر پڑھیے، وہ انہی دونوں چیزوں کو، جن کو آپ سوسائٹی کی سب سے بڑی برائی خیال کرتے ہیں، سب سے بڑی نیکی کی حیثیت سے ذکر کرے گا اس لیے کہ دوستوں کی مدارات، غریبوں کی ہمدردی، بیواؤں کی سرپرستی اور یتیموں کی اعانت کا سب سے بڑا ذریعہ ان کے یہاں یہی چیزیں تھیں۔ عرب کے فیاض اور رند مشرب لوگوں کا یہ قاعدہ تھا کہ جاڑوں کے موسم میں

جبکہ عرب میں قحط کا زمانہ ہوتا، شراب نوشی کی مجلسیں منعقد کرتے اور شراب کی بدمستی میں نہایت قیمتی اونٹوں کو ذبح کر دیتے اور پھر ان کے گوشت کی ڈھیریاں لگا کر ان پر جوا کھیلتے اور جو گوشت جیتتے اس کو غریبوں اور محتاجوں میں بانٹ دیتے۔

جوئے اور شراب کے یہی فضائل تھے جن کی بنا پر قرآن میں جب ان کی حرمت کے احکام نازل ہوئے تو لوگوں کو تعجب ہوا کہ اتنی مفید چیزیں اسلام نے حرام کیوں ٹھہرا دیں؟ قرآن نے ان لوگوں کے جواب میں اس امر کا تو اعتراف کیا کہ شراب اور جوئے میں بعض تمدنی فوائد ضرور ہیں، لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ظاہر کر دی کہ ان کے تمدنی نقصانات کا پہلو ان فوائد کے مقابل میں غالب ہے اس وجہ سے ان کو حرام ٹھہرایا جا رہا ہے۔

یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ قرآن مجید نے خمر و میسر کا تذکرہ فیاضی کی تعلیم کے سلسلہ میں کیا ہے جو اس بات کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ اہلِ عرب میں یہ چیزیں رذائل میں نہیں، بلکہ فضائل میں داخل تھیں اور انہوں نے ان کو محض عیاشی اور لعو و لعب کے طور پر نہیں اختیار کیا تھا، بلکہ سوسائٹی کی ایک بہت بڑی عزت سمجھ کر اختیار کیا تھا۔

اب غور کیجیے کہ جن لوگوں کو یہ تمام داستان معلوم تھی ان کے لیے "قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ" کی اصل حقیقت تک پہنچ جانا کیا مشکل تھا؟ لیکن بعد کے زمانوں میں، جب یہ تمام باتیں نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں تو تاویل کا یہ رُخ آخر لوگوں کے سامنے کس طرح آ سکتا تھا؟

اس حقیقت کی مزید وضاحت مطلوب ہو تو سورۂ نور میں دیکھیے۔ اس میں اصلاحِ معاشرت کے بہت سے احکام بیان ہوئے ہیں۔ بظاہر ان کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہے، لیکن جب ڈوب کر مطالب پر غور کرنے کی کوشش کیجیے تو اس

عہد کے معاشرتی حالات کے متعلق طبیعت میں بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کلام اپنی وضاحت کے لیے ان معلومات کا منتظر ہے۔ یہاں تک کہ بعض مواقع پر، جب تک حالات کی پوری تفصیل سامنے نہ آجائے، طبیعت کی خلش دور نہیں ہوتی۔ سورۂ توبہ وغیرہ سمجھنے کے لیے اس عہد کے سیاسی تغیرات و انقلابات اور ان تمام سیاسی و مذہبی پارٹیوں کو جاننا ضروری ہوتا ہے جو اسلام کے ظہور نے پیدا کردی تھیں۔

غرض ہر عہد کے کلام میں اس عہد کے تمدن، اخلاق، سیاست اور مذہب کی ایسی حقیقتیں مضمر ہوتی ہیں جن سے مطلع ہوئے بغیر اس کلام کی بہت سی خوبیاں اور باریکیاں سمجھ میں نہیں آتیں اور یہ بات کچھ قرآن مجید ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے ہر کلام کا حال یہی ہے۔ ہومر اور شیکسپیئر کو پوری طرح سمجھنے کے لیے بھی ہم کو یہی کرنا پڑتا ہے کہ بے شمار خارجی چیزوں کی مدد سے ہم اپنے اردگرد ہومر اور شیکسپیئر کا ماحول تیار کرتے ہیں۔ ہومر اور شیکسپیئر تو خیر زمانۂ قدیم کے فسانے ہیں، ان کے تمدن اور ہمارے تمدن میں نہ صرف زمانہ کا فرق ہے، بلکہ دونوں کی اصل و نسل اور وطن و مرز بوم بھی مختلف ہیں، میر اور غالب کو لیجیے جو اپنی ہی قوم کے شاعر تھے اور ابھی ان کے کلام پر کچھ ایسا زمانہ بھی نہیں گزرا ہے۔ کیا ان کے سمجھنے کے لیے ہم ان چیزوں کے محتاج نہیں ہوتے؟

الاصلاح[1] نمبر ا میں استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مضمون 'ترتیب و نظامِ قرآن' کے عنوان سے شائع ہوا تھا اس کی مندرجہ ذیل سطریں نہایت غور سے پڑھنے کے قابل ہیں:

1۔ دائرۂ حمیدیہ سرائے میر اعظم گڑھ (یوپی) کا ماہوار رسالہ جو ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۹ء تک جاری رہا اور پھر بند ہوگیا۔

(۱) ہم کو لازم ہے کہ زمانۂ نزولِ قرآن کی پوری حالتِ تمدّن سے ہم واقف ہوں۔
(۲) ہم کو اس وقت کے یہود و نصاریٰ، مشرکین و صابئین وغیرہ کے مذہب و معتقدات سے واقف ہونا چاہیے۔
(۳) ہم کو عرب کے عام توہمات کو دریافت کرنا چاہیے۔
(۴) ہم کو جاننا چاہیے کہ نزولِ قرآن کی مدّت میں کیا کیا واقعات نئے پیدا ہوئے اور ان سے عرب کی مختلف جماعتوں میں کیا کیا مختلف باتیں زیرِ بحث آگئیں، کیا کیا ملکی و تمدنی جھگڑے چھڑ گئے اور تمام عرب میں کیا شورش پیدا ہوگئی۔
(۵) ہم کو یہ بھی جاننا چاہیے کہ عرب کا مذاقِ سخن کیا تھا۔ کس قسم کے کلام سننے اور بولنے کے وہ عادی تھے۔ بزم میں ان کا خطیب کس روش پر چلتا تھا، ایجاز اور اطناب، ترصیع و ترکیب و دیگر اسالیبِ خطابت کو وہ کیونکر استعمال کرتے تھے۔
(۶) اور بالآخر ہم کو یہ بھی جاننا چاہیے کہ عرب کے ذہن میں اخلاق کے مدارج نیک و بد کیا تھے۔

سلف کا طریقۂ تفسیر:

انہی وجوہ سے سلف کا طریقۂ تفسیر یہ رہا ہے کہ پہلے وہ قرآن کو خود قرآن کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کرتے، اس کے بعد اگر کوئی مشکل باقی رہ جاتی تو اس کا حل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال میں تلاش کرتے، اس کے بعد بھی اگر معاملہ کا کوئی گوشہ محتاجِ توضیح رہ جاتا تو اس کے لیے صحابہ رضی اللہ عنہم کے آثار و اقوال سے مدد لیتے کیونکہ قرآن مجید جن لوگوں کے حالات و واقعات پر اترا اور جن کو اس نے سب سے پہلے مخاطب کیا وہ قرآن مجید کے اسرار و حکم اور اس کے رموز

حقائق کو جس خوبی کے ساتھ سمجھ سکتے تھے اس خوبی کے ساتھ دوسرے لوگ، جن کو وہ حالات میسر نہیں ہیں، کسی طرح نہیں سمجھ سکتے۔ علامہ سیوطی تفسیر کا یہ طریقہ بتاتے ہیں :

قال العلماء: من اراد تفسیر الکتٰب العزیز طلبه اولا من القرآن فما اجمل منه فی مکان فقد فسر فی موضع آخر وما اختصر فی مکان فقد بسط فی موضع آخر منه۔ وقد الف ابن الجوزی کتابًا فیما اجمل فی القرآن وفسر فی موضع آخر منه وقد اشرت الی امثلة منه فی نوع المجمل۔ فان فاعیاه ذٰلک طلبه من السنة فانها شارحة للقرآن وموضحة له وقد قال الشافعیؒ: کلما حکم به رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم فهو مما فهمه من القرآن۔ قال اللّٰہ تعالیٰ: اِنَّآ اَنۡزَلۡنَآ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ لِتَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ وفی آیات

علماء نے کہا ہے کہ جو شخص قرآن مجید کی تفسیر کرنا چاہے وہ قرآن مجید سے تفسیر کرے۔ اس میں جو چیز ایک جگہ مجمل ہے، دوسری جگہ اس کی تفسیر کر دی گئی ہے اور جو بات ایک جگہ مختصر ہے دوسرے مقام پر بالکل مفصل ہے۔ ابن جوزی نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں قرآن کی ان تمام آیات سے تعرض کیا ہے جو ایک جگہ مجمل اور دوسری جگہ مفصل ہیں اور میں نے خود مجمل کے بیان میں اس کی بعض مثالوں کی طرف اشارہ کیا ہے اگر کہیں اس میں کامیابی نہ ہو — یعنی قرآن کی تفسیر خود قرآن سے نہ ہو سکے — تو سنت میں اس کی تفسیر تلاش کرے کیونکہ سنت قرآن کی شارح اور مفسر ہے۔ حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام فیصلے قرآن مجید سے مستنبط ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "ہم نے یہ کتاب

اخر، وقال صلی اللہ علیہ وسلم: الا انی اوتیت القرآن ومثلہ معہ یعنی السنۃ فان لم یجدہ من السنۃ رجع الی اقوال الصحابۃ فانھم ادری بذالک لما شاھدوہ من القرآن والاحوال عند نزولہ ولما اختصوابہ من الفھم التام والعلم الصحیح والعمل الصالح[1]۔	تم پر حق کے ساتھ اتاری ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے تمہیں دکھایا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: مجھے قرآن دیا گیا اور اسی کے مثل اس کے ساتھ یعنی سنت، پس اگر سنت میں بھی نہ پائے تو صحابہؓ کے اقوال کی طرف متوجہ ہو، وہ اس کے سب سے بڑھ کر جاننے والے ہیں، اس لیے کہ انہوں نے نزولِ قرآن کے وقت تمام قرآن وحالات کا خود مشاہدہ کیا ہے، نیز فہم کامل اور علم صحیح وعملِ صالح سے بھی آراستہ تھے۔

تفسیر کا یہ طریقہ بالکل فطری ہے۔ اصل چیز خود قرآن کے الفاظ اور اس کی اپنی توضیحات ہیں۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اور تیسرا درجہ اقوال صحابہ کا ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریحات اور صحابہؓ کے اقوال کی روشنی میں قرآن مجید کو سمجھنا چاہتے ہیں وہ قرآن کے الفاظ کی حکومت باطل نہیں کرنا چاہتے۔ ہم نے اوپر جو قول نقل کیا ہے اس میں تفسیر کے لیے اصل الاصول خود قرآن مجید کے الفاظ اور اس کی توضیحات ہی کو قرار دیا گیا ہے کہ "القرآن یفسر بعضہ بعضاً"، ہاں اگر کوئی بات ایسی ہے جو خود قرآن مجید

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن، ج ۲، ص ۱۷۵-۱۷۶

سے صاف نہیں ہو رہی تو اس کے لیے آدمی کہاں جائے؟ ایک آزاد خیال آدمی بھی اس سوال کا جواب یہی دے گا کہ ایسی مشکلات میں بہترین رہنمائی سنتِ رسول اور اقوالِ صحابہ کی رہنمائی ہی سے ہو سکتی ہے اس لیے کہ جس پر قرآن اترا اور جن لوگوں کی اصلاح و تربیت کے لیے اترا وہ اس کو جس قدر بہتر سمجھ سکتے ہیں، دوسرے اس قدر بہتر نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن اس رہنمائی کی صورت کیا ہوگی؟ یہ ہوگی کہ ایک آیت پر اس کے الفاظ کی روشنی میں پوری طرح غور کیا۔ قرآن مجید میں جو آیات اس کی مماثل ہیں، ان کی روشنی میں بھی اس کو اچھی طرح دیکھ لیا۔ سیاق و سباق اور عمود و نظم کے پہلو سے بھی اس پر نگاہ ڈال لی، لیکن ان تمام باتوں کے بعد بھی پوری تشفی نہیں ہوتی۔ الفاظ کچھ چاہتے ہیں، لیکن صاف نہیں معلوم ہوتا کیا چاہتے ہیں، اب ہم احادیث اور اقوالِ صحابہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور کوئی ایسی بات پالیتے ہیں جس سے اس آیت کا تمام عالم روشن ہو جاتا ہے، الفاظ کو اس کے بعد کسی بات کا انتظار نہیں رہ جاتا، نظم اور سیاقِ کلام سب کا حق ادا ہو جاتا ہے تو اس بات کو، اگر وہ صحیح طریقہ سے منقول ہوگی، قبول کر لیں گے۔ یہ نہیں کریں گے کہ آیت کے الفاظ کسی توضیح و تشریح کے منتظر ہوں یا نہ ہوں، لیکن ایک بات، جو ہم نے روایات کے ذخیرہ میں دیکھ لی ہے، خواہ مخواہ اس پر چسپاں کر دیں اگرچہ نظم و سیاق، آیاتِ مماثل اور نصوصِ کتاب و سنّت، سب اس کے علانیہ مخالف ہوں۔ اسی قسم کے غلو نے لوگوں میں احادیث و آثار کی طرف سے بدگمانی پیدا کی اور وہ خیالات پھیلے جن کا صدرِ مضمون میں ہم حوالہ دے چکے ہیں۔ اہلِ تحقیق کا یہ مذہب کبھی نہیں رہا ہے۔ انہوں نے تفسیرِ قرآن کے معاملہ میں ہمیشہ قرآن مجید ہی کو مقدم رکھا۔ ہاں اگر کوئی مقام محتاجِ توضیح ہوا اور صحیح احادیث اور ثابت آثار سے اس کی تشریح ہو گئی تو اس سے انہوں نے پورا فائدہ اٹھایا اور یہ ایک ایسی بات ہے

جس کے جائز ہونے پر کسی کو بھی اعتراض نہیں ہو سکتا۔

اب صرف یہ بات رہ گئی کہ یہ احادیث و آثار صحیح و ثابت ہوں، ضعیف و موضوع نہ ہوں۔ سو یہ ایک ایسی بات ہے جس سے کسی کو اختلاف نہیں ہے ہمارے علماء نے خود اس بات پر نہایت اہمیت کے ساتھ توجہ دلائی ہے۔ اتقان میں ہے،

لطلب التفسير ماخذ	تفسیر کے بہت سے ماخذ ہیں، جن میں
كثيرة امهاتها اربعة:	سے چار اصول کی حیثیت رکھتے ہیں: اوّل
الاول، النقل عن النبي	وہ نقل ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
صلى الله عليه وسلم وهٰذا	سے مروی ہے اور یہی مقدم ترین ہے، لیکن
هو الطراز المعلم لكن	اس باب میں ضعیف و موضوع سے احتراز
يجب الحذر من الضعيف	واجب ہے، کیونکہ اس قسم کی روایات
منه والموضوع فانه	بہت سی ہیں۔ اسی وجہ سے امام احمد بن
كثير و لهٰذا قال احمد	حنبلؒ نے فرمایا ہے کہ تین قسم کی کتابیں
ثلاث كتب لا اصل لها: المغازي	ایسی ہیں جن کی کوئی اصل نہیں ہے:
والملاحم والتفسير[1]	مغازی، ملاحم اور تفسیر۔

یہ کوئی نہیں کہتا کہ رطب و یابس ہر قسم کی روایات پر اعتماد کر لیا جائے۔ سب یہی کہتے ہیں کہ پوری تحقیق و تنقید کے بعد جو روایات قابلِ قبول نکلیں اور روایت و درایت کے تمام اصولوں پر جانچنے کے بعد پکی ثابت ہو جائیں، صرف وہی روایات لی جائیں۔ ہم ذاتی تجربہ کی بنا پر یہ رائے رکھتے ہیں کہ صحیح روایات اور قرآن میں کوئی تعارض نہیں ہے، بلکہ قرآن مجید کی بہترین تفسیر روایاتِ صحیحہ، آثارِ

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن: ج ۲، ص ۱۷۸

ثابتہ اور سنن متواترہ کے اندر محفوظ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ کیا اور جو کچھ فرمایا سب سر تا سر قرآن سے ماخوذ ہے۔ اوپر ضمناً امام شافعیؒ کا قول نقل ہو چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے فیصلے فرمائے سب قرآن مجید سے ماخوذ ہیں: قال الشافعیؒ: کلما حکم به رسول الله صلی الله علیه وسلم فهو مما فهمه من القرآن' (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے فیصلے فرمائے سب قرآن مجید سے ماخوذ ہیں) ایسی حالت میں قرآن اور حدیث میں تعارض کیونکر ہو سکتا ہے۔ عموماً لوگ احادیث کے ذخیرہ میں سے صرف اتنے ہی حصّہ کو قرآن سے متعلق سمجھتے ہیں جو ابواب تفسیر کے عنوان سے درج ہوتا ہے، بقیہ کو قرآن سے غیر متعلق خیال کرتے ہیں حالانکہ حدیث سر تا سر فہم قرآن ہے۔ احادیث پر اگر وقتِ نظر کے ساتھ غور کیا جائے تو حدیث و قرآن کا گہرا تعلق نہایت واضح طور پر سامنے آجاتا ہے۔

تاہم حدیث کی حیثیت اصل کی نہیں ہے، فرع کی ہے، اصل قرآن مجید ہی ہے۔ وہ جس طرح تمام کتبِ سابقہ کے لیے کسوٹی ہے اسی طرح تمام کتبِ مابعد کے لیے بھی کسوٹی ہے۔ اگر کسی روایت اور آیت میں تعارض ہوگا تو آیت کی تاویل نہیں کی جائے گی، روایت کی تاویل کی جائے گی، آیت اپنی جگہ پر بدستور قائم رہے گی۔ ہمیشہ سے اہلِ تحقیق کا یہی مذہب رہا ہے۔ نسخ کے بارہ میں امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کا مذہب تمام کتبِ اصول فقہ میں مذکور ہے کہ ان کے نزدیک سنت قرآن مجید کی کسی آیت کو منسوخ نہیں کر سکتی۔ اگرچہ اس رائے سے اختلاف رکھنے والوں نے ان پر اس مسئلہ کی وجہ سے بڑی نکتہ چینی کی ہے، یہاں تک کہ شارحِ مسلم الثبوت نے اس کو مکابرت تک کہہ دیا ہے، لیکن مذہبِ حق یہی ہے۔

امام صاحب کے دلائل اصولِ فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ اصول میں خود ان

کا بھی رسالہ ہے جس میں انہوں نے اپنے مسلک کے دلائل بیان کیے ہیں. علامہ آمدی نے بھی اپنی کتاب میں ضروری تفصیل کی ہے بلکہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر اہلِ ظاہر کا یہی مذہب بتایا ہے پھر تعجب ہے کہ امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کا یہ مذہب ہے، جو حدیث و روایت میں صاحب البیت (گھر کے بھیدی) کا درجہ رکھتے ہیں تو فقہاء اور متکلمین کا مذہب اس سے الگ کیوں ہو!

بہرحال اگر حدیث کو اس درجہ میں رکھ کر قرآن مجید کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو ان سے قرآن کے سمجھنے میں نہایت قیمتی مدد ملے گی، کوئی رکاوٹ نہیں پیدا ہو گی۔ ہمارے نزدیک احادیث کو اس درجہ سے بڑھانا زیادتی ہے اور اس سے گرانا انتہائی بدبختی اور محرومی ہے۔ جو لوگ آج احادیث سے بے پروا ہو کر قرآن مجید کو سمجھنا چاہتے ہیں ان کی مثال اس پرجوش اور الھڑ نوجوان کی ہے جو سمندر میں بغیر کشتی کے پھاند پڑا ہے اور خیال کرتا ہے کہ پیر کر سمندر پار کر جائے گا۔ یہ اپج قابلِ داد ہے لیکن یہ کھلی ہوئی خودکشی ہے جس کو اللہ تعالیٰ کبھی معاف نہیں کرے گا۔

شانِ نزول:

اوپر روایات و آثار پر ہم نے جو اصولی بحث کی ہے وہ روایات اور قرآن مجید کے تعلق کو پوری طرح واضح کر دینے کے لیے بالکل کافی ہے لیکن خاص طور پر شانِ نزول سے متعلق بعض شبہات لوگوں کے دلوں میں ایسے بھی پیدا ہوتے ہیں جن کے ازالہ کے لیے ضروری ہے کہ اس اصولی بحث سے الگ ہو کر چند سطریں مسئلہ کے خاص حالات کو پیشِ نظر رکھ کر بھی لکھ دی جائیں۔

تفسیروں کے مطالعہ میں ایک بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے کہ تقریباً ہر آیت کے ذیل میں کوئی نہ کوئی واقعہ بطور شانِ نزول بیان ہوتا ہے، بلکہ بعض آیات کے

تحت متعدد واقعات ہوتے ہیں اور ان میں بسا اوقات باہم دگر اختلاف، بلکہ کھلا ہوا تضاد ہوتا ہے اور عموماً یہ واقعات ایسے تعجب انگیز اور آیت کے سیاق و سباق سے اس قدر بے تعلق ہوتے ہیں کہ طبیعتیں ان کو قبول کرنے سے جھجکتی ہیں۔

لوگوں کو اس طرح کی روایات پر دو قسم کے شبہات ہیں، ایک یہ کہ ان واقعات میں سے اکثر واقعات ایسے ہیں جن کو آیات سے کوئی تعلق نہیں ہے، دوسرا یہ کہ اگر ہر آیت سے متعلق ایک یا چند واقعات بطور شانِ نزول تسلیم کر لیے جائیں تو قرآن مجید میں نظم و تسلسل کی تلاش بالکل بے فائدہ ہے، کیونکہ نظم کلام کے تسلسل کو چاہتا ہے اور ہر آیت کا کسی خاص واقعہ سے متعلق ہونا تسلسل کے بالکل منافی ہے۔ یہ شبہ سورۂ انعام کی تفسیر میں حضرت امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی پیدا ہوا اور وہ اس کا کوئی تشفی بخش جواب دیے بغیر آگے بڑھ گئے۔ آیت 'وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا' کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ولی ھٰھنا اشکال وھو: ان الناس اتفقوا علیٰ ان ھٰذہ السورۃ نزلت دفعۃ واحدۃ واذا کان الامر کذٰلک فکیف یمکن ان یقال فی کل واحدۃ من اٰیات السورۃ ان سبب نزولھا ھٰذا ھو الامر الفلانی بعینہ؟[1]	میرے سامنے یہاں ایک سخت اشکال ہے۔ وہ یہ کہ لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ یہ پوری سورہ بیک دفعہ نازل ہوئی جب معاملہ یوں ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ سورہ کی ہر آیت کی نسبت یہ کہا جائے کہ اس کے نزول کا سبب فلاں واقعہ ہے؟

جہاں تک پہلے شبہ کا تعلق ہے اس کے ازالہ کے لیے اوپر کے بعض مباحث

---

[1] التفسیر الکبیر: ج ۱۳، ص ۲۰۲

کافی ہیں یعنی تفسیر کے لیے صحیح اصول یہ ہے کہ روایات سے پہلے نفسِ آیت کے الفاظ اور سیاق و سباق پر تدبر کرنا چاہیے۔ اگر الفاظ اپنے مفہوم کو پوری وضاحت کے ساتھ ادا کر رہے ہیں، آیت کی صحیح تاویل بغیر کسی خارجی مدد کے، بالکل بے نقاب ہوگئی ہے، نظم، عمود اور حسنِ تاویل کے جملہ شرائط پوری طرح ادا ہوگئے ہیں تو کچھ ضروری نہیں ہے کہ ایک ایسے واقعہ کو آیت پر چسپاں کیا جائے جو اس کے نظم و سیاق کو درہم برہم اور اس کے حسنِ تاویل کو مجروح کرنے والا ہو۔ ہاں اگر شانِ نزول آیت کی واضح اور صحیح تاویل کی تائید کر رہا ہے تو وہ مزید اطمینان اور شرحِ صدر کا باعث ہوگا، اس کو نظر انداز کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے اس کو مثال سے یوں سمجھنا چاہیے کہ جس طرح ایک طبیب ایک نسخہ کو دیکھ کر اور اس کے اجزاء اور ان کی باہمی ترکیب پر غور کر کے پتہ لگا لیتا ہے کہ وہ کس مرض کے لیے لکھا گیا ہے اسی طرح قرآن مجید کے طالب علم کو آیات کے مطالب اور ان کی باہمی ترتیب و ترکیب پر تدبر کر کے سورہ کا شانِ نزول خود سورہ سے معلوم کرنا چاہیے اور پھر مزید بصیرت اور طمانیت کے لیے ان واقعات پر غور کرنا چاہیے جو بطور شانِ نزول اس آیت کے تحت بیان کیے گئے ہیں۔ اس صورت میں کمزور ضعیف روایات سے لغزش کا اندیشہ نہیں ہے۔ قرآن مجید کی روشنی صحیح راستہ کی طرف خود رہبری کر دے گی۔ جو روایتیں صحیح ہوں گی وہ بجائے کوئی خلجان اور تشویش پیدا کرنے کے شرحِ صدر اور اطمینانِ قلب پیدا کریں گی۔ اور جو روایتیں ضعیف ہوں گی وہ خود بخود سامنے سے ہٹ جائیں گی۔

اوپر حضرت امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کے جس شبہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ شبہ بھی کچھ زیادہ قوی نہیں ہے۔ اہلِ تحقیق کے جوابات سے، جو اصولِ تفسیر کی کتابوں میں مذکور ہیں، اس کا پوری طرح ازالہ ہو جاتا ہے۔ علامہ سیوطیؒ اس قسم کے شبہات

کے جواب میں فرماتے ہیں :

قال الزرکشی فی البرھان:	زرکشی نے برہان میں لکھا ہے کہ صحابہؓ و
قد عرف من عادۃ الصحابۃ	تابعینؒ کا یہ طریقہ عام ہے کہ ان میں
والتابعین ان احدھم	سے جب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ یہ
اذا قال : نزلت ھٰذہ	آیت فلاں بارہ میں نازل ہوئی، تو
الآیۃ فی کذا فانہ یرید	اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس آیت
بذٰلک انھا تتضمن ھذا	میں اس بات کا بھی حکم موجود ہے،
الحکم لا ان ھذا کان	یہ مطلب نہیں ہوتا ہے کہ یہ بات بعینہٖ
السبب فی نزولھا فھو من	اس کے نزول کا سبب ہے۔ گویا یہ
جنس الاستدلال علی الحکم	اس آیت سے اس معاملہ پر ایک
بالآیۃ لا من جنس النقل	استدلال ہوتا ہے نہ کہ نقلِ واقعہ۔
لما وقع[1]	

اس باب میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق بھی یہی ہے۔ وہ الفوز الکبیر میں فرماتے ہیں :

آنچہ از استقراء کلام صحابہ وتابعین معلوم می شود	حضرات صحابہ وتابعین کے کلام پر غور وفکر سے
آنست کہ نزلت فی کذا نہ محض برائے قصہ کہ در	یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ فرمانا کہ یہ آیت فلاں
زمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بودہ وسبب نزول	بارہ میں نازل ہوئی کسی ایسے واقعہ کے ساتھ
آیت گشتہ استعمال کنند بلکہ گاہے یکے از ما صدق	ہی مخصوص نہیں ہوتا جو عہدِ نبوی میں واقع ہو
علیہ آیت را کہ در زمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم	کر نزولِ وحی کا سبب بنا۔ بلکہ ان کا معمول

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن : ج ۱، ص ۳۱

بوده است یا بعد آزاں حضرت ذکر کنند و گویند
نزلت فی کذا و در اینجا انطباق جمیع قیود لازم نیست
بلکہ اصل حکم می باید کہ منطبق باشد پس بس و گاہے
سوالے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آوردہ باشند
یا حادثہ کہ در آں ایام نیک فرجام متحقق شدہ باشند
و آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حکم آں را از آیتے استنباط
کردہ باشند و آں آیت را در آں باب تلاوت
نمودہ باشند تقریر نمایند و نزلت فی کذا و
گاہے در ایں صورت ہا گویند فانزل اللہ تعالیٰ
قولہ کذا یا فنزلت گویا ایں اشارت باں سمت
کہ استنباط آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ازاں آیت بود
القائے آں آیت در آں ساعت بخاطر مبارک
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نیز نوعے از وحی و نفث
فی الروع ست ازیں جہت میتواں گفت فانزلت
و اگر کسی در اینجا بتکرار نزول تعبیر کند نیز می تواند شد
محدثین در ذیل آیات قرآن چیزہائے بسیار تقریر می
کنند کہ بہ حقیقت نہ از قسم سبب نزول باشد مثل
استشہاد صحابہ در مناظرات خود بآیت یا تمثیل ایشاں
بآیت یا تلاوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آیت را
برائے استشہاد کلام خود یا روایت حدیثے کہ موافق
آیت باشد در اصل غرض یا تعیین موضع نزول

یہ ہے کہ وہ ایسے واقعات کا جو آیت کے مطالب
سے مطابقت رکھتے ہوں، قطع نظر اس سے کہ
وہ عہدِ نبوی میں وقوع پذیر ہوئے ہوں یا اس کے
بعد، ذکر کر کے کہہ دیتے ہیں کہ یہ فلاں بارہ میں
نازل ہوئی۔ ایسی شکلوں میں اس آیت کا
بعینہٖ منطبق ہونا چنداں ضروری نہیں ہے صرف
اصل حکم میں انطباق کافی ہے اور بسا اوقات ایسا
بھی ہوتا ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی
خدمت میں کوئی سوال پیش کیا، یا آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کے عہد مبارک میں کوئی واقعہ رونما ہوا اور
آپ نے اس کا حکم کسی آیت سے مستنبط فرمایا اور اس
کو اس موقع پر تلاوت فرمایا تو ایسی صورتوں میں وہ
کہہ دیا کرتے ہیں کہ یہ آیت اس بارہ میں اتری ایسی
ہی شکلوں میں کبھی وہ یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ اس پر
اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا یا یہ وحی آتری۔ اس سے
ان کا اشارہ اس بات کی طرف ہوتا ہے کہ نبی
صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت سے استنباط فرمایا
اور اس وقت چونکہ آپ کے قلبِ مبارک پر اس آیت
کا القا بھی وحی اور الہام خداوندی کی نوعیت کا ہوتا ہے
اس لیے ایسے مواقع پر "فانزلت" کا استعمال
درست ہے اور اگر کوئی شخص اس کو تکرار نزول سے

یا تعیین اسماء مذکورین بطریق ابہام یا طریق تلفظ کلمہ قرآنیہ یا فضل سورہ و آیت قرآن یا صورت امتثال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بامرے از اوامر قرآنی واین ہمہ درحقیقت از اسباب نزول ست و شرط مفسر احاطہ بآں نیست۔[1]

تعبیر کرنا چاہے تو بھی ٹھیک ہے۔ محدثین حضرات قرآن کی آیات کے تحت بہت سی باتیں بیان کرجاتے ہیں جو اصلاً اسباب نزول میں داخل نہیں ہوتیں۔ اس کی مثالیں ہیں: صحابۂ کرام کا اپنے باہمی مذاکروں میں کسی آیت سے استنباط و استدلال، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی آیت کو اپنے استنباط کے لیے تلاوت فرمانا، کسی ایسی حدیث کا بیان جس کو آیت کے ساتھ اس کے مقصود یا موقع نزول یا بعض اسماء کے ابہام کی توضیح یا کسی قرآنی کلمہ کے صحیح تلفظ کی ادائیگی کے لیے مفید خیال کیا گیا ہو، سورتوں اور آیات کے فضائل کا بیان اور قرآن کے احکام کی بجاآوری میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی صحیح تصویر۔ حقیقت میں یہ سب چیزیں اسباب نزول میں شامل نہیں ہیں اور ایک مفسر کے لیے ان کا احاطہ ضروری نہیں ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ "نزلت فی کذا" اور "فانزل اللہ تعالیٰ قولہ" یا "فنزلت" "والنزلت" وغیرہ کی اصطلاحات صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم کے نزدیک کیا مفہوم رکھتی تھیں اور شان نزول سے متعلق جو روایات تفسیر کی کتابوں میں مذکور ہیں ان کی نوعیت کیا ہے۔ ان کی حیثیت استنباط و استدلال اور تطبیق کی ہے

---

[1] الفوز الکبیر فی اصول التفسیر: باب دوم، فصل دوم

یا نقل و بیان کی ؟ سارا اشکال یہیں سے پیدا ہوا تھا کہ لوگوں نے سمجھا کہ سلف جس آیت کی نسبت کہتے ہیں کہ 'نزلت فی کذا' تو اس سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ بعینہٖ وہی واقعہ اس آیت کے نزول کا سبب ہے، لیکن اوپر علامہ زرکشیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے جو اقوال نقل ہوئے ہیں ان سے صاف ہوگیا کہ 'نزلت فی کذا' یا 'فانزل اللہ تعالیٰ قولہ' وغیرہ اصطلاحات کا وہ منشا نہیں ہے جو لوگ سمجھتے ہیں، بلکہ یہ استنباط واستدلال کے قسم کی ایک چیز ہے۔ یعنی اس کا منشا یہ ہوتا ہے کہ اس آیت سے فلاں بات نکلتی ہے۔ اس حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد تمام شبہات آپ سے آپ رفع ہو جاتے ہیں۔

تفسیر اور شانِ نزول کی کتابوں میں بعض اوقات ایک آیت کا سببِ نزول کوئی ایسا واقعہ بیان ہوتا ہے جس کا زمانہ اور آیت کے نزول کا زمانہ کسی طرح ایک نہیں ہو سکتا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سورہ تو مدنی ہوتی ہے اور شانِ نزول جو بیان کیا جاتا ہے وہ مکّی زندگی سے متعلق ہوتا ہے۔ اسی طرح آیت کبھی مکّی ہوتی ہے اور شانِ نزول جو بیان کیا جاتا ہے وہ مدنی زندگی سے متعلق ہوتا ہے بلکہ بعض شانِ نزول تو ایسے ملتے ہیں جن کے زمانۂ وقوع اور ان سے متعلق آیت کے نزول کے زمانوں میں مدتوں کا فرق ہے۔ ایسے مواقع پر اگر طالب علم کو یہ بات معلوم نہ ہو کہ صحابہ کرامؓ اور تابعینِ عظام کے نزدیک شانِ نزول کا حقیقی مفہوم کیا ہے تو اس کو مطالعہ میں سخت زحمتیں پیش آتی ہیں، بلکہ اس کو شک و انکار کی ان حالتوں سے کشمکش کرنی پڑتی ہے جن کا صدرِ مضمون میں ہم نے حوالہ دیا ہے۔

با ایں ہمہ ہم کو اس سے انکار نہیں کہ شانِ نزول کے معاملہ میں لوگوں نے بہت افراط سے کام لیا ہے۔ شاید ہی کوئی آیت ایسی نکلے جس کے نیچے کوئی قصّہ

درج نہ ہوا ور عموماً یہ قصے بالکل بے بنیاد اور محدّثین کے نزدیک ناقابلِ اعتبار ہیں۔ طالبِ قرآن کو ان قصوں میں نہیں الجھنا چاہیے۔ ان قصّوں کو قرآن کے فہم میں نہ صرف یہ کہ کوئی دخل نہیں ہے، بلکہ یہ قرآن کے لیے حجابِ اکبر ہیں بالخصوص جو طلبہ نظمِ قرآن کے جویا ہوں (اور فہمِ قرآن کی اصل راہ یہی ہے) ان کے لیے ان قصوں سے بڑھ کر کوئی روک نہیں ہے۔ حضرت امام رازیؒ کو جو اشکال پیش آیا تھا اور جس کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے، وہ اسی قسم کے قصوں کا پیدا کردہ تھا۔ اس قسم کے قصوں کے ساتھ کسی طالبِ قرآن کے لیے حقیقت کا سراغ لگانا ناممکن ہے۔

یہ احساس صرف ہمارا ہی نہیں ہے، بلکہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ بھی فرماتے ہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

دانستہ شود کہ اکثر اسبابِ نزول در فہمِ معانی آیات دخل ندارد اللھم الا شئے قلیل و آنچہ محمد بن اسحٰق کلبی دریں باب افراط کردہ اند و زیرِ ہر آیتے قصہ آوردہ اند نزدیکِ محدثین اکثر غیر صحیح است و در اسناد آں نظر است۔ آنرا شرطِ تفسیر دانستن خطائے مبین است و بر حفظ آں تدبرِ کتاب اللہ را موقوف داشتن حظِ خود را از کتاب اللہ فوت کردن است[1]۔

یہ بات جاننے کی ہے کہ شانِ نزول کے بڑے حصّہ کو آیاتِ قرآن کے سمجھنے میں کوئی دخل نہیں ہے۔ اس کا کارآمد حصہ بہت تھوڑا ہے اور یہ محمد بن اسحٰق کلبی نے جو اس باب میں زیادتی کی ہے اور ہر آیت کے تحت ایک قصّہ نقل کر دیا ہے اس کا بڑا حصّہ محدّثین کے نزدیک غیر صحیح اور اس کی اسناد محلِ نظر ہے اور اس کو شرطِ تفسیر جاننا سخت غلطی ہے اور کتابِ الٰہی کے تدبر کو اس پر موقوف رکھنا اپنے آپ کو کتابِ الٰہی سے محروم کرنا ہے۔

---

[1] الفوز الکبیر فی اصول التفسیر: باب دوم، فصل دوم

پس قصص و واقعات کے بارہ میں صحیح مسلک یہ ہے کہ صرف ان قصوں کو معلوم کرنے کی کوشش کی جائے جن کی طرف آیاتِ قرآن خود اشارہ کر رہی ہیں اور جن کا معلوم ہونا آیت کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے:

حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں:

شرطِ مفسر معرفت دو چیز است: یکے قصصے کہ آیات تعریض بآں می کنند پس فہم ایمائے ایں آیات بغیر معرفت آں قصص میسر نمیشود و دیگر قصہ کہ تخصیص عام یا مثل آں از وجوہ صرف از ظاہر می نماید پس فہم مقصد آیات بدوں آں قصص میسر نشود[1]۔	مفسر کیلئے قصص میں سے دو طرح کے قصوں کو جاننا ضروری ہے: ایک وہ قصے جن کی طرف آیاتِ قرآن اشارہ کر رہی ہوں۔ اس طرح کی آیات کے اشارات کو ان قصوں کو جانے بغیر سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ دوسرے وہ قصے جو کسی عام کو خاص کر رہے ہوں یا اس طرح کوئی بات جو ظاہر مطلب سے ہٹا کر کسی اور حقیقت کی طرف لے جانے والی ہو۔ بے شبہ اس طرح کی آیتوں کو ان قصوں کی مدد کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا۔

یہاں ہم مذکورہ بالا قسم کے قصوں کی، جن کی طرف قرآن کی آیتیں اشارہ کر رہی ہیں، بعض مثالیں بھی ذکر کیے دیتے ہیں۔ اس کی ایک عمدہ مثال سورۂ مجادلہ میں ہے۔ فرمایا ہے:

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ	اللہ نے سن لی اس عورت کی بات جو تم سے اپنے شوہر کے بارہ میں جھگڑ رہی تھی اور اللہ

---

[1] الفوز الکبیر فی اصول التفسیر: باب دوم، فصل دوم

يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا إِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ ○	سے شکوہ کر رہی تھی اور اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ بے شک اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔
(المجادلۃ ۔ ۵۸ : ۱)	

مذکورہ بالا آیت میں جس عورت کے جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے وہ اگر پورا تفصیل کے ساتھ معلوم ہو تو اس سے اس آیت کے سمجھنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے اسی طرح سورۃ احزاب کی مندرجہ ذیل آیات میں حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ کے واقعات کی طرف سرسری اشارات ہیں جن کی وضاحت ان واقعات کے تفصیلی علم سے ہو سکتی ہے :

وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِي أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ ج وَاللّٰهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ ط فَلَمَّا قَضَى زَيْدٌ مِنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنَاكَهَا لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ط	اور جب کہ تم اس سے، جس پر اللہ نے بھی انعام کیا اور تم نے بھی انعام کیا، یہ کہہ رہے تھے کہ اپنی بیوی کو روکے رکھو اور اللہ سے ڈرو اور تم اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ ظاہر کرنے والا تھا۔ اور تم لوگوں سے ڈرتے تھے حالانکہ اللہ زیادہ حق دار ہے اس بات کا کہ تم اس سے ڈرو۔ پس جب زید نے اس سے اپنا رشتہ کاٹ لیا تو ہم نے اس کو تم سے بیاہ دیا کہ مومنوں کے لیے ان کے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے معاملے میں، جب کہ وہ ان سے اپنا تعلق بالکل کاٹ لیں، کوئی تنگی باقی نہ رہے
(الاحزاب ۔ ۳۳ ۔ ۳۷)	

اسی طرح سورۂ تحریم کی مندرجہ ذیل آیتوں میں بھی بعض واقعات کی طرف اشارہ ہے، جن سے واقف ہونا آیتوں کے سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے:

وَإِذْ أَسَرَّ النَّبِيُّ إِلَىٰ بَعْضِ	اور جب کہ نبی نے اپنی ایک بیوی سے ایک
أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا فَلَمَّا	راز کی بات کہی تو جب انہوں نے اس کو خبر
نَبَّأَتْ بِهِ وَأَظْهَرَهُ اللَّهُ	کر دی اور اللہ نے اس سے پیغمبر کو آگاہ کر دیا
عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهُ وَأَعْرَضَ	تو پیغمبر نے کچھ بات جتا دی کچھ ٹال دی تو
عَنْ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّأَهَا بِهِ	جب پیغمبر نے بیوی کو اس کی خبر کی تو وہ
قَالَتْ مَنْ أَنْبَأَكَ هَٰذَا قَالَ	بولیں کہ آپ کو کس نے اس کی خبر دی؟
نَبَّأَنِيَ الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ	پیغمبر نے کہا: مجھے خدائے علیم و خبیر نے
(التحریم - ۶۶ : ۳)	خبر دی۔

یہ اور اس طرح کی دوسری آیات اس وقت تک پوری طرح سمجھ میں نہیں آسکتیں جب تک ان واقعات کو نہ معلوم کر لیا جائے جن کی طرف یہ اشارہ کر رہی ہیں۔ پس اس طرح کے مواقع پر شانِ نزول کی جستجو بلاشبہ ضروری ہے، لیکن ایسے مواقع قرآن مجید میں بہت زیادہ نہیں ہیں صرف چند ہیں اور عموماً صحیح حدیثوں میں ان کی تفصیلات موجود ہیں۔

اس سلسلہ میں بھی یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ پہلے قرآن مجید کی آیت پر غور کرنا چاہیے۔ اس کے الفاظ خود بخود واقعہ کی تمام جزئیات نگاہوں کے سامنے کر دیتے ہیں۔ لیکن اگر واقعہ کا کوئی پہلو مخفی رہ جائے اور آیت کے الفاظ ان کو ڈھونڈ رہے ہوں تو مزید اطمینان کی خاطر صحیح ذرائع سے قصہ معلوم کرنا چاہیے اور اس کا پورا خیال رکھنا چاہیے کہ وہ قرآن کے اشارات سے ٹھیک مطابق ہو، اس سے مختلف یا اس کے مخالف ہرگز نہ ہو۔

خلاصۂ مباحث :

پچھلے صفحات میں جو مطالب بیان کیے گئے ہیں اب مختصر لفظوں میں ان کا ضروری خلاصہ لکھ دیتے ہیں تاکہ مدعا نگاہ کے سامنے آجائے :

۱۔ قرآن مجید کلام کی اس صنف میں داخل ہے جو بعض اعتبارات سے نہایت آسان و سہل ہوتی ہے اور بعض اعتبارات سے نہایت دقیق اور مشکل، اس لیے یہ خیال کرنا کہ یہ ایک سپاٹ کتاب ہے، جس کو سمجھنے کے لیے کسی کاوش اور عمیق مطالعہ کی ضرورت نہیں ہے، بالکل غلط ہے۔ قرآن مجید، جہاں تک عام تعلیم کا تعلق ہے، بالکل واضح ہے۔ یہ پہلی ہی نظر میں حرام و حلال کے تمام حدود متعین کر دیتا ہے اور نیکی و بدی کے پہچاننے کے لیے تمام آثار اور علامتیں نمایاں کر دیتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس میں ایک عمیق فلسفہ اور گہری حکمت بھی ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے سرسری طور سے گزر جانا کافی نہیں ہے، بلکہ اس پر ٹھہر کر تدبر کرنا چاہیے۔

۲۔ قرآن مجید کی نسبت یہ خیال بالکل غلط ہے کہ وہ محض احکام و قوانین کا مجموعہ اور حرام و حلال کے معلوم کرنے کا ایک خشک اور سیدھا سادا ضابطہ ہے۔ قرآن مجید کی ترکیب، خود اس کی تشریحات کے مطابق، تین اجزاء سے ہے: آیات اللہ، یعنی دلائل و براہین؛ کتاب، یعنی قوانین و احکام؛ حکمت، یعنی روحِ شریعت اور جوہرِ دین۔ پہلا حصہ دین کی منطق ہے، دوسرا حصہ دین کا نظام ہے، تیسرا حصہ دین کا فلسفہ ہے۔ اس لیے قرآن مجید تفکر و تدبر کی چیز ہے۔ چنانچہ حضرات صحابہ کرامؓ اس کی ایک ایک سورہ پر آٹھ آٹھ برس تدبر فرماتے تھے، حلقے قائم کر کے اس کی مشکلات پر غور فرماتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی دشواریوں میں مدد چاہتے تھے، عقل کی طمانیت، روح و دل کی پاکی اور دنیا کی معیشت و سیاست کے لیے اس کو بالکل کافی سمجھتے تھے۔

اور یہ جو بعض جلیل القدر صحابہؓ نے فرمایا ہے کہ کتاب اللہ ہمارے لیے کافی ہے تو اس کا مطلب یہی تھا کہ ہمارے دین و دنیا اور عقل و روح کو جو کچھ مطلوب ہے قرآن مجید وہ سب کچھ اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اس نے جسم کے لیے تو سب کچھ دیا ہو، لیکن روح کے لیے اس کے پاس کوئی تشفی نہ ہو۔ یا حلال و حرام کا ضابطہ تو اس نے ہمارے سامنے رکھ دیا ہو جو معیشتِ دنیا میں ہمارے کام آسکے لیکن ہماری عقل کی بے چینیوں اور دماغ کی الجھنوں کو یوں ہی چھوڑ دیا ہو، ان کے سلجھانے کے لیے ہمیں یونانیوں کی خرافات، متکلّمین اور فلاسفہ کی موشگافیوں اور محققّینِ عصر کی تحقیقات کا ممنون ہونا پڑے۔

۳- قرآن میں کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس سے یہ نکلتا ہو کہ وہ ایک سپاٹ کتاب ہے۔ اس کے برعکس اس میں بے شمار آیات اس مضمون کی ہیں کہ اس پر تدبّر کرنا چاہیے۔ بغیر تدبّر کے اس کی تعلیمات سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ جو لوگ قرآن مجید کو گہری کتاب نہیں سمجھتے اور آیت " وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ " (القمر - ۵۴ : ۱۷) (اور ہم نے قرآن کو تذکیر کے لیے نہایت موزوں بنایا ہے، تو ہے کوئی یاددہانی حاصل کرنے والا!) سے اپنے خیال کی صحت پر دلیل لاتے ہیں، ان کا استدلال بالکل کمزور، بلکہ غلط ہے۔ آیتِ مذکورہ کا وہ مطلب نہیں جو عموماً سمجھا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ نے حصولِ علم اور تعلیم کے لیے بالکل مکمل اور نہایت موزوں بنایا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ تمام پہلوؤں سے بالکل لیس ہے، اس میں کوئی کسر نہیں ہے۔ ' يَسَّرْنَا ' کا لفظ صرف اس کے آسان ہونے کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ دراصل اس کے کمال، اس کی جامعیت اور اس کے استقصاء و موزونیت کو ظاہر کرتا ہے اور اسی سے اس کا آسان ہونا بھی نکلتا ہے کیونکہ جو چیز ایک مقصد کے لیے پوری ہموار اور استوار کر لی گئی ہے وہ اس

مقصد کے لیے یقیناً سہل اور آسان بھی ہوگی۔

۴۔ جو لوگ قرآن مجید کی تفسیر کے باب میں صرف روایات ہی پر اعتماد کرتے ہیں یقیناً وہ غلو کرتے ہیں۔ یہ بات محققین کے مذہب اور طریقہ کے بالکل خلاف ہے۔ قرآن مجید کی تفسیر میں اصل الاصول خود قرآن کے الفاظ، اس کے شواہد و نظائر اور کلام کے سیاق و سباق اور اس کے نظم کا لحاظ ہے۔ ضروری ہے کہ ہر آیت کی تاویل میں ان چیزوں کو مقدم رکھا جائے۔ کسی حال میں ان سے اغماض نہ کیا جائے۔ لیکن یہ بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ روایات و احادیث کی رہنمائی کے بغیر تفسیرِ قرآن کی مشکلات حل نہیں ہو سکتیں۔ قرآن مجید جس عہد کا کلام ہے اور جن لوگوں کو اول اول اس نے مخاطب کیا ہے، قدرتی طور پر اس عہد کی بے شمار خصوصیات اور اس قوم کے بے شمار حالات کی طرف وہ اشارے کرتا ہے جن کو پوری طرح بے نقاب کرنے کے لیے ہم ان لوگوں کی اعانت سے مستغنی نہیں ہو سکتے جو اس کے اوّلین مخاطب تھے۔ ان کی مدد سے یہ فائدہ اٹھانا قرآن مجید کے الفاظ کی حکومت کو باطل کرنا نہیں ہے اور نہ ذرہ برابر اس سے اس کی قطعیت میں کوئی فرق آتا ہے۔ کیونکہ ہم روایات و آثار کی رہنمائی سے وہیں فائدہ اٹھاتے ہیں جہاں قرآن کے الفاظ اشارہ کر رہے ہوتے ہیں کہ ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔

یہ دعویٰ اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے کہ قرآن مجید اپنے سمجھے جانے کے لیے کسی چیز کا محتاج نہیں ہے۔ لیکن قرآن کی تفسیر میں روایات و آثار کی رہنمائی سے فائدہ اٹھانا قرآن کے محتاج ہونے کا ثبوت نہیں ہے۔ یہ ہمارے محتاج ہونے کا ثبوت ہے اور ہمارے محتاج ہونے اور قرآن کے محتاج ہونے میں بڑا فرق ہے۔ ہم قرآن سمجھنے کے لیے زبان اور نحو سے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن مجید اپنے سمجھے جانے کے لیے ان چیزوں کا محتاج ہے۔ پس اس سے قرآن مجید کے کمال

پر کوئی حرف نہیں آتا۔

۵۔ شانِ نزول سے بھی قرآن مجید کی قطعیّت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ شانِ نزول کی حیثیت وہ نہیں ہے جو لوگوں نے عام طور پر سمجھ رکھی ہے۔ محققین کے نزدیک در استنباط کے قسم کی چیز ہے، یعنی صحابہؓ جو یہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت فلاں واقعہ پر اتری یا فلاں بارہ میں نازل ہوئی تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس آیت کے نزول کا سبب بعینہٖ وہی واقعہ ہے بلکہ اس کا مطلب بالعموم یہ ہوتا ہے کہ وہ آیت فلاں حکم پر مشتمل ہے۔ معاملہ کی یہ حقیقت واضح ہو جانے کے بعد اس راہ کے تمام اشکالات خود بخود رفع ہو جاتے ہیں اور پھر ان سے بھی قرآن کی تفسیر میں وہیں فائدہ اٹھانا چاہیے جہاں قرآن کے الفاظ داعی ہوں اور ان کی مدد سے کوئی گتھی سلجھ رہی ہو اور ایسے مواقع، جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، قرآن مجید میں بہت زیادہ نہیں ہیں۔

تفسیر کے اصول

(تقریر جو ۱۵ر دسمبر ۱۹۵۱ء کو پنجاب یونیورسٹی کے ایم اے (اسلامیات) کے طلبہ کے سامنے کی گئی، بعض اجمالات کی وضاحت کے ساتھ)

آپ نے مجھے اصولِ تفسیر پر تقریر کرنے کی دعوت دی ہے۔ میں نے اس موضوع پر آپ کے سامنے گفتگو کرنے کے لیے جو نقشہ سوچا ہے وہ یہ ہے کہ میں پہلے اختصار کے ساتھ ان طریقوں کی وضاحت کروں گا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے مبارک دور کے گزرنے کے بعد ہمارے مختلف مکاتبِ خیال کے مفسّرین نے تفسیر میں اختیار کیے۔ پھر مختصراً ان طریقوں کی خامیوں پر تنقید کروں گا۔ اس کے بعد میں تفسیر کے وہ اصول پیش کروں گا جو میرے نزدیک صحیح اصول ہیں۔ جن کے صحیح ہونے کی ہماری عقل تصدیق کرتی ہے اور جو میرے علم کے مطابق، دورِ صحابہؓ کے اہلِ تاویل ہمیشہ اپنے پیشِ نظر رکھتے رہے ہیں۔ تقریر کا یہ نقشہ ایک طرف تو آپ کے سامنے وہ سارے طریقے اجمال کے ساتھ پیش کر دے گا جو دورِ صحابہؓ کے بعد سے ہمارے مفسّرین اور اہلِ تاویل نے اختیار کیے ہیں اور دوسری طرف وہ سارا مواد آپ کے سامنے اکٹھا ہو کر آجائے گا جو اہلِ تفسیر کے مختلف مکاتبِ خیال کے اصولوں میں موازنہ کرنے اور ان کے حق و باطل میں امتیاز کرنے کے لیے ضروری ہے۔

ہماری تاریخ کے مختلف زمانوں میں تفسیر سے متعلق جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان سب پر نگاہ ڈال کر، اگر ان کے نقطہ ہائے نظر کے اختلاف کو سامنے رکھتے ہوئے، ان کو الگ الگ کیا جائے تو ہمارے سامنے چار بڑے مکتبِ خیال، اپنے مخصوص اصولوں کے ساتھ، نمایاں ہوں گے۔ میں یہاں مختصراً ان چاروں مکاتبِ خیال اور ان کے طریقۂ تفسیر کا آپ کے سامنے تعارف کراؤں گا۔

محدثین اور اہلِ روایت کا طریقہ:

ہمارے اہلِ تفسیر میں سب سے زیادہ معتبر گروہ محدثین اور اہلِ روایت کا ہے۔ اس گروہ کا اصول یہ ہے کہ تفسیر میں اصلی اعتماد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات، صحابہؓ کے آثار اور اہلِ تاویل کے اقوال پر کیا جائے۔ چنانچہ ان لوگوں کی سب سے بڑی کوشش تفسیر میں یہ رہی ہے کہ ہر آیت کے تحت اہلِ تاویل کے جس قدر اقوال مل سکیں وہ جمع کر دیے جائیں۔ یہ اقوال بسا اوقات ایک دوسرے کے بالکل مخالف بھی ہوئے ہیں، لیکن نہ تو ان میں کوئی توفیق پیدا کرنے کی کوشش کی گئی اور نہ ان میں کسی انتخاب کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اس اصول پر تفسیر کی جو سب سے بڑی کتاب لکھی گئی ہے اور آج بھی موجود ہے وہ ابنِ جریر رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور تفسیر جامع البیان ہے۔ اس تفسیر میں تمام تفسیری روایات اور اہلِ تاویل کے تمام اقوال کا پورا ذخیرہ موجود ہے۔ ہر آیت کے تحت آپ کو متعدد اقوال مل جائیں گے اور آپ یہ امتیاز نہیں کر سکیں گے کہ ان میں سے کون سا قول صحیح ہے اور کون سا غلط ہے۔ روایتی طریق پر تفسیر کی جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سے بیشتر کا ماخذ یہی کتاب ہے۔ جس طرح چراغ سے چراغ جلا لیے جاتے ہیں اسی طرح اس کتاب کے حذف و اختصار سے بہت سی کتابیں تیار کر لی گئی ہیں۔ ابنِ کثیرؒ کی مشہور تفسیر بھی اسی تفسیر سے نکلی ہوئی ہے۔

متکلمین کا طریقہ:

مسلمانوں کا تعلق جب عجمی قوموں سے ہوا اور ان کے علوم اور ان کے فلسفہ سے ان کو سابقہ پڑا تو دینی مسائل پر سوچنے کا وہ اندازِ فکر وجود میں آیا جس کو ہم علمِ کلام کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس علمِ کلام نے بھی ہمارے اندر مختلف مکتبِ خیال پیدا کیے اور ان میں سے ہر مکتبِ خیال کے لوگوں نے اپنے مخصوص افکار و نظریات کو مسلمانوں میں مقبول بنانے کے لیے قرآن مجید کی تفسیریں لکھیں۔ ان تفسیروں کا مقصد درحقیقت قرآن مجید کی تفسیر لکھنے سے زیادہ ان افکار و نظریات کے دلائل فراہم کرنا تھا جو ان تفسیروں کے لکھنے والوں نے اپنے متکلمانہ طرزِ فکر سے پیدا کیے تھے۔ اس طرز پر ہمارے ہاں جو تفسیریں لکھی گئیں ان میں سب سے زیادہ مشہور اور اہمیت رکھنے والی تفسیریں دو ہیں: ایک علامہ زمخشری رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کشاف اور دوسری امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کبیر۔ ان میں سے مقدم الذکر معتزلہ کے مکتبِ خیال کے ترجمان ہیں اور مؤخر الذکر اپنی تفسیر میں ہر جگہ اشاعرہ کے نظریات کی وکالت کرتے ہیں۔ روایاتی تفسیروں میں جو اہمیت ابنِ جریر رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کو حاصل ہے کلامی طرز کی تفسیروں میں وہی اہمیت امام رازیؒ اور زمخشریؒ کی تفسیروں کو حاصل ہے۔ بعد میں جن لوگوں نے اس طرز پر تفسیریں لکھی ہیں انہوں نے انہی کی خوشہ چینی کی ہے۔

مقلدین کا طریقہ:

مقلدین سے میری مراد یہاں ائمۂ فقہ یا کتبِ فقہ کے مقلدین سے نہیں ہے، بلکہ مفسرین اور ان کی کتابوں کے مقلدین سے ہے۔ ابن جریرؒ، امام رازیؒ اور زمخشریؒ کی تفسیروں کے بعد تفسیر کی جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ اکثر و بیشتر یا تو انہی سے ماخوذ و مستنبط

ہیں یا انہیں کی تلخیص اور انہی کا اختصار ہیں۔ ان کے بعد ایسی تفسیریں بہت کم لکھی گئی ہیں جن کی اپنی کوئی مستقل بنیاد ہو۔ یہاں تک کہ آہستہ آہستہ تفسیر نگاری کا مقبول عام طریقہ ہی یہی ٹھہر گیا کہ جو کچھ لکھا جائے پچھلی تفسیروں میں سے کسی نہ کسی کی سند پر لکھا جائے۔ قرآن کے کسی ترجمہ یا اس کی کسی تفسیر کے مستند ہونے کے لیے یہ بات بالکل کافی سمجھی جانے لگی کہ اس کی ہر بات کی سند پچھلی تفسیروں میں مل جائے۔ چنانچہ ہمارے اس دورِ آخر میں مذہبی طبقہ کی طرف سے قرآن مجید کے جو ترجمے یا تفسیریں شائع ہوئی ہیں ان کی سب سے بڑی خصوصیت اگر کوئی بتائی جا سکتی ہے تو وہ غالباً یہی ہے کہ ان ترجموں یا تفسیروں کو ہماری پچھلی تفسیروں کی تصدیق و تائید حاصل ہے۔ ان میں سے کسی نے بھی ان حدود سے باہر جانے کی جرأت نہیں کی ہے جو ابن جریرؒ، امام رازیؒ، امام سیوطیؒ، امام شوکانیؒ اور قاضی بیضاویؒ نے قائم کر دیے تھے۔ عام طور پر ترجمہ یا تفسیر میں اس قول پر حرف رکھنے کی گنجائش نہیں سمجھی جاتی جو پچھلی تفسیروں میں سے کسی تفسیر سے ماخوذ ہو۔ ایسی مثالیں بہت کم ملیں گی کہ اس سہل اور مامون طریقہ کو چھوڑ کر قرآن مجید کی مشکلات کے حل کی راہ میں کوئی قدم آگے بڑھایا گیا ہو۔

متجدّدین کا طریقہ:

متجدّدین سے مراد وہ لوگ ہیں جو جدید مغربی افکار و نظریات سے متاثر ہیں۔ جس طرح ہمارے متکلمین نے یونانی فلسفہ سے متاثر ہو کر اپنے کچھ مخصوص نظریات پیدا کیے اور ان پر قرآن مجید کو ڈھالنے کی کوشش کی اور اس چیز میں ان کو اتنا غلو ہوا کہ انہوں نے دوسری تمام حقیقتوں سے آنکھیں بند کر لیں، اسی طرح متجدّدین کے گروہ نے مغربی افکار و نظریات کو اپنا امام بنا لیا اور پھر نہایت بے دردی کے ساتھ قرآن مجید کو ان افکار و نظریات کے پیچھے پیچھے گھسیٹنے کی کوشش کی۔ ہماری قوم میں اس طریقہ

تفسیر کی طرح سرسید مرحوم نے ڈالی اور اس کے بعد سے یہ فتنہ برابر بڑھتا ہی گیا ہے۔ اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اُس کی کتاب کب تک جاہلوں اور اغراض کے بندوں کی تاویل بازیوں کا نشانہ بنی رہے گی۔

مذکورہ بالا طریقوں پر تنقید :

اب میں مذکورہ بالا تمام طریقوں پر مختصراً تنقید کرکے یہ بتاؤں گا کہ ان طریقوں میں نمایاں خرابیاں کیا کیا ہیں ؟

سب سے پہلے اصحاب الرّوایت کے طریقہ کو لیجیے۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ مذکورہ بالا تمام طریقوں میں سب سے زیادہ پاکیزہ اور مامون طریقہ تفسیر کا یہی ہے۔ اس طریقہ کی اصلی خصوصیت تفسیر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ رضی اللہ عنہم اور سلف کے اقوال کا اہتمام ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر کرنے کا حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ سے زیادہ نہ کسی کو ہو سکتا اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کی تفسیر سے زیادہ کسی کی تفسیر صحیح ہو سکتی ہے لیکن اس طریق میں چند خرابیاں نہایت واضح ہیں جن کا کوئی صاحبِ علم انکار نہیں کر سکتا۔

۱۔ تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بطریقِ مرفوع بہت کم منقول ہے۔ اسی طرح صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی تفسیر کے سلسلہ میں کچھ زیادہ منقول نہیں ہے۔ یہ ہماری تفسیر کی کتابیں زیادہ تر بعد کے اہل تاویل کے اقوال سے معمور ہیں اور ظاہر ہے کہ ان اہلِ تاویل کا یہ مقام نہیں ہو سکتا کہ ان کو تفسیر میں مدارِ کل قرار دے دیا جائے۔

۲۔ پھر خود ہمارے محدثین کا بیان ہے کہ تفسیری روایات میں وہ احتیاطیں ملحوظ نہیں رکھی گئی ہیں جو احکام و قوانین والی روایات میں ملحوظ رکھی گئی ہیں۔ حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیری روایات کی بے اصلیت کی تصریح نہایت واضح الفاظ میں فرمائی

ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ اس معاملہ میں ان کی تصریح کس قدر اہمیت رکھتی ہے۔ چنانچہ ہماری تفسیر کی کتابیں بے اصل روایات سے بھری پڑی ہیں اور ان کے غلط و صحیح میں امتیاز کرنا نہایت مشکل کام ہے۔

۳۔ اگر ان روایات کی تحقیق و تنقید کر کے ان کے اندر جو مغز ہے اس کو الگ بھی کیا جا سکے جب بھی تنہا انہی کو تفسیر میں فیصلہ کن چیز قرار دینا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ یہ روایات صحت کے معیار پر پوری اترنے کے بعد بھی ظن کے شائبہ سے پاک نہیں ہو سکتی ہیں۔ اس لیے اگر قرآن مجید کی تفسیر میں تنہا انہی کو فیصلہ کن چیز مان لیا جائے تو قرآن مجید کی قطعیت کو نقصان پہنچے گا اور یہ چیز کسی طرح بھی گوارا نہیں کی جا سکتی۔ دوسرے دلائل و شواہد کے ساتھ مل کر تو بلاشبہ یہ روایات قرآن مجید کے صحیح مفہوم کی تعیین میں بہت زیادہ مددگار ہو سکتی ہیں، لیکن تنہا انہی کی مدد سے کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

۴۔ ہماری تفسیر کی کتابوں میں ایک ایک آیت، بلکہ بسا اوقات ایک ایک لفظ کے تحت اہلِ تاویل کے متعدد اقوال، بغیر ان کے دلائل کے ذکر کے، نقل کر دیے گئے ہیں۔ یہ اقوال اکثر حالات میں ایک دوسرے سے متناقض ہیں۔ ظاہر ہے کہ تفسیر کا یہ طریقہ نہایت غلط ہے۔ قرآن مجید اپنی دلالت میں بالکل قطعی ہے، اس لیے لازم ہے کہ ان متعدد اقوال میں سے وہی اختیار کیے جائیں جو قرآن مجید کے سیاق و سباق اور دوسرے قرائن کے مطابق ثابت ہوں، ورنہ قرآن کا قطعی الدلالت ہونا معرضِ خطر میں پڑ جاتا ہے۔

اب متکلمین کے طریقہ کو لیجیے۔ متکلمین کے طریقہ میں بنیادی خرابی یہ ہے کہ اپنے نظریات کو اصل قرار دے کر قرآن کو ان کے مطابق بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور جہاں کہیں قرآن ان کے نظریات کے سانچہ میں نہیں ڈھلتا ہے وہاں بجائے اس کے کہ وہ اپنے نظریات کی اصلاح کریں اور ان کو قرآن کے مطابق بنائیں، ان کی ساری کوشش

اس بات کے لیے ہوتی ہے کہ کسی طرح قرآن مجید کو توڑ مروڑ کر اپنے نظریات کے مطابق بنالیں سلف کے اقوال میں یہ لوگ انہی اقوال کو اختیار کرتے ہیں جو ان کے اپنے نظریات کے مطابق ہوتے ہیں جو ان کے پیش نظر منشا کے مطابق نہیں ہوتے ان کو وہ بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس کی بے شمار مثالیں ہم کو امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر میں مل سکتی ہیں۔ وہ بسا اوقات اشاعرہ کے کلامی نظریات کو صحیح ثابت کرنے میں حدودِ تفسیر سے اس قدر متجاوز ہو جاتے ہیں کہ اگر کوئی آیت ان کو صریحاً مسلکِ اشاعرہ کے خلاف نظر آتی ہے تو اس کی تردید میں یہ کہنے میں بھی ان کو باک نہیں ہوتا کہ ہمارا جو اصول براہنیات (کلامی دلائل) سے ثابت ہے وہ محض اس بنا پر مجروح نہیں ہو سکتا کہ ایک آیت کے الفاظ، جن کی دلالت تمام تر سماع پر مبنی ہے، اس کے خلاف ہیں۔ اس رجحانِ تفسیر کے ساتھ قرآن کا کتابِ ہدایت ہونا بالکل خارج از بحث ہو جاتا ہے۔ یہاں قرآن مجید رہنما اور امام نہیں رہتا، بلکہ اس کو چند کلامی نظریات کے تابع بن کر چلنا پڑتا ہے اور یہ چیز دوسرے الفاظ میں کتابِ الٰہی کی نفی ہے۔

کتبِ تفسیر کے مقلدین کے طریقہ میں وہی خرابی ہے جو ائمۂ فقہ یا کتبِ فقہ کے مقلدین کے طریقہ میں ہے۔ جس طرح ائمۂ فقہ بجائے خود سند نہیں ہیں بلکہ سند کتاب و سنت ہیں اور ائمۂ فقہ کی صرف وہی باتیں قابلِ قبول ہو سکتی ہیں جو کتاب و سنت کی کسوٹی پر کھری ثابت ہوں، اسی طرح ہماری تفسیر کی کتابوں میں سے بجائے خود کسی کتاب کو سند ہونے کی حیثیت حاصل نہیں ہے، ان کی وہی باتیں صحیح ہو سکتی ہیں جو صحت کی عقلی و نقلی کسوٹیوں پر پوری اتریں۔ اس لیے مجرد یہ بات کہ فلاں تاویل امام رازیؒ یا ابن جریرؒ کی تفسیر میں موجود ہے اس کے صحیح ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اس کی صحت یا غلطی کا فیصلہ کرنے کے لیے ہمیں بالکل دوسرے ہی ذرائع سے کام لینا پڑے گا۔

متجددین کے طریقہ میں بعینہٖ وہی خرابی موجود ہے جو ہم متکلمین کے طریقہ میں واضح کر

چکے ہیں متکلمین نے جس طرح فلسفۂ یونان کے زیر اثر اپنے کچھ خاص نظریات تراشے اور پھر ان کو شریعت کی سند دینے کے لیے قرآن کو توڑا مروڑا اسی طرح جو حضرات مغرب کے جدید افکار و نظریات سے مرعوب ہوئے انہوں نے اپنے ان نظریات کو مسلمانوں میں مقبول بنانے کے لیے پوری بے دردی سے قرآن مجید پر ہاتھ صاف کیا۔ مصر کے علامہ طنطاوی اور ہندوستان کے سرسید مرحوم اور ان کے نقش قدم پر چلنے والوں نے جو کچھ لکھا ہے اگر اس کو پڑھیے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ہمارے پچھلے متکلمین پھر بھی غنیمت تھے کہ اپنے نظریات کی پیچ کے ساتھ ساتھ وہ کچھ پاس قرآن کی زبان، اس کی نحو، اس کے سیاق و سباق یا کم از کم سنتِ متواترہ کا ملحوظ رکھتے تھے۔ لیکن ہمارے متجدد حضرات نے تو تمام حدیں بالکل توڑ ڈالی ہیں اور اس بے شرمی کے ساتھ توڑ ڈالی ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ ان حضرات کے خیال میں اب دنیا میں پڑھے لکھے لوگ باقی نہیں رہ گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرز کی تفسیروں کو تفسیر کہنا صحیح نہیں ہے، بلکہ ان کو قرآن کی تحریف کہنا چاہیے۔

تفسیر کے صحیح اصول:

اب میں آپ کے سامنے تفسیر کے وہ اصول پیش کروں گا جو میرے نزدیک صحیح ہیں اور جن کے صحیح ہونے کی گواہی عقل بھی دیتی ہے اور جو از روئے نقل بھی صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک یہی وہ اصول ہیں جو ہمارے سلفِ صالحین قرآن مجید کی تاویل میں پیش نظر رکھتے رہے ہیں۔

یہ اصول دو طرح کے ہیں:

ایک وہ ہیں جو بالکل قطعی ہیں، ان میں کسی قسم کے ظن یا شبہ کو کوئی دخل نہیں ہے۔ وہ قرآن مجید کی تفسیر کے بلا اختلاف ماخذ ہیں۔ ان کی رہنمائی میں جو تفسیر کی

جائے گی، اگرچہ ہمارے قصورِ استعمال اور ہماری علمی کوتاہیوں کی وجہ سے غلطیاں اس میں بھی ہوں گی، لیکن اصول کے حد تک وہ بالکل صحیح تفسیر ہوگی اور اپنے نتائج کے اعتبار سے بھی زیادہ سے زیادہ قرینِ صحت ہوگی۔

دوسرے وہ اصول ہیں جو ظنی ہیں۔ قرآن مجید کی تاویل و تفسیر میں وہ مددگار تو ہیں اور ان کی رہنمائی سے توضیحِ مطالب اور حلِ مشکلات میں نہایت قیمتی مدد بھی ملتی ہے، لیکن چونکہ ان میں ظن اور شبہ کو دخل ہے اس لیے ان سے صرف اسی حد تک رہنمائی حاصل کی جاسکے گی جہاں تک وہ قرآن کی موافقت کریں اور ان سے قرآن کے کسی اشارہ یا تلمیح کی وضاحت ہو رہی ہو۔

تفسیر کے چار قطعی اصول:

تفسیر کے قطعی اصول چار ہیں۔ یہ چاروں اصول جہاں تک ہمارے بیان کرنے کا تعلق ہے الگ الگ بیان ہوں گے۔ لیکن یہ تفسیر قرآن میں استعمال بالکل ایک ساتھ ہوں گے ایک ساتھ استعمال ہونے ہی کی وجہ سے ان کے اندر وہ استحکام پیدا ہوتا ہے جو ان کو قطعیت کا درجہ دیتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو، بلکہ ان کو الگ الگ استعمال کرنے کی کوشش کی جائے تو ان میں سے اکثر اپنی قطعیت کھو بیٹھیں گے۔

۱۔ پہلا اصول یہ ہے کہ تفسیر کا اوّل ماخذ اس زبان کو بنایا جائے جس زبان میں قرآن مجید اترا ہے۔ میری مراد یہاں اس عام عربی زبان سے نہیں ہے جو عام طور پر لکھی اور بولی جاتی ہے۔ اس زبان کو قرآن مجید کی زبان سے بہت کم تعلق ہے۔ قرآن مجید جس عربی زبان میں اترا ہے وہ آپ کو مصر و شام کے رسائل یا وہاں کے مصنفین و مولفین کی کتابوں میں نہیں مل سکے گی، بلکہ اس کے لیے آپ کو امرؤ القیس، لبید، زہیر، عمرو بن کلثوم اور حارث بن حلزہ وغیرہ اور عرب کے خطبائے جاہلیت کے کلام کی طرف رجوع

کرنا پڑے گا اور اس کلام کی آپ کو اس حد تک ممارست بہم پہنچانی پڑے گی کہ آپ اس کے اصلی و نقلی میں امتیاز کر سکیں، اس کے اسالیب و محاورات کو اچھی طرح سمجھ سکیں، اس کے حسن و قبح کو متعین کر سکیں، اس کے انداز ایجاز و اطناب کو معلوم کر سکیں، اس کی تلمیحات و اشارات سے محظوظ ہو سکیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کام ہے بہت مشکل، لیکن جو لوگ قرآن مجید کو سمجھنا چاہتے ہیں وہ جب تک اس مشکل کو اپنے لیے آسان نہیں بنائیں گے وہ قرآن مجید کے فہم میں تفسیروں اور ترجموں کی خوشہ چینی سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔

قرآن مجید کے الفاظ و اسالیب کے معنی متعین کرنے میں یہ ضروری ہے کہ لفظ یا اسلوب کے وہ معنی لیے جائیں جو کلام کے عام استعمالات میں معروف و مشہور ہیں، وہ معنی ہرگز نہ لیجیے جو غیر معروف ہیں۔ قرآن مجید معروف و مشہور زبان میں اترا ہے، اس کے الفاظ شاذ معانی میں استعمال نہیں ہوئے ہیں۔ اس اصل کو جن لوگوں نے پیشِ نظر نہیں رکھا ہے انہوں نے بسا اوقات الفاظ کے ایسے معانی لے لیے ہیں جو عربی زبان میں معروف نہیں ہیں۔ عام طور پر تو اس طرح کی غلطی کا نتیجہ کچھ زیادہ خطرناک نہیں ہوتا، زیادہ سے زیادہ وہ یہ ہوتا ہے کہ کسی آیت کی تاویل میں معروف معنی کے بجائے غیر معروف معنی لے لیے جاتے ہیں لیکن اسی طرح الفاظ کے شاذ معنی لے کر گمراہ فرقوں نے جو فتنے اٹھائے ہیں اگر ان کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ معروف معنی کو چھوڑ کر شاذ معنی لینے کا فتنہ دین میں کیسا سخت و شدید ہے اور اس سے کتنی بڑی بڑی آفتیں برپا ہو سکتی ہیں۔

قرآن مجید کی نحو کے متعلق بھی قابلِ اطمینان طریقہ یہی ہے کہ نحو کی عام کتابوں کے بجائے اس کا ماخذ کلامِ عرب کو بنایا جائے۔ ہمارے اہلِ نحو نے تتبع اور تلاش کی کمی کی وجہ سے قرآن مجید کے بہت سے استعمالات کو شواذ اور مستثنیات میں ذکر کیا ہے، حالانکہ قرآن مجید عرب کے معروف اسلوب پر اترا ہے، اس لیے یہ نہیں ہو سکتا کہ معروف اسلوب دوسرے ہوں اور قرآن مجید کا اسلوب غیر معروف ہو۔ میرے استاد مولانا حمید الدین

فراہی علیہ الرحمۃ نے اس طرح کے کتنے ہی اسالیب کو، جو اہل نحو کے نزدیک غیر معروف سمجھے جاتے تھے اپنی تلاش و تتبع سے معروف ثابت کر دیا۔ اس کا فائدہ صرف یہی نہیں ہوتا کہ قرآن مجید کے اسالیب شواذ و مستثنیات کی ثانوی فہرست میں گنے جانے کے بجائے معروف اسالیب کی صف اول میں آجاتے ہیں۔ بلکہ اکثر مقامات میں معانی کے تعین اور تاویل کے انتخاب پر بھی اس کا نہایت گہرا اثر پڑتا ہے، اس لیے اس کو محض ایک علمی کاوش سمجھ کر نظر انداز کر دینا صحیح نہیں ہے۔

زبان کے سلسلہ میں آپ کو فنِ بلاغت سے بھی واسطہ پڑے گا۔ بالخصوص اس وجہ سے کہ ہم مسلمان قرآن کو ایک معجزہ مانتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کی کوئی نظیر نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن مجید کے اس وصف کو جانچنے کے لیے جو فن سب سے زیادہ کام دے سکتا ہے وہ فنِ بلاغت ہی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارا فنِ بلاغت تمام تر مبنی ہے ان اصولوں پر جو یونانیوں سے لیے گئے ہیں۔ یہ اصول یونانی ادب کی خوبیوں اور بلاغتوں کے پرکھنے کے لیے تو معیار بن سکتے ہیں، لیکن ان کو قرآن حکیم کی فصاحت و بلاغت کے جانچنے کے لیے کسوٹی بنانا ایسا ہی ہے جیسے کوئلے تولنے کی ترازو سے اشرفیاں تولنے کی کوشش کی جائے۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ ہمارے اہلِ فن نے کسی حد تک اس بات کی کوشش کی ہے کہ اس فن کو عربی زبان کے ادبی تقاضوں اور اس کے خاص رجحانات اور میلانات سے مانوس کریں تاکہ یہ عربی ادب کی خوبیوں کے جانچنے کے بھی کام آسکے، لیکن اس سلسلہ میں وہ عربی شاعری کے حدود سے آگے نہیں بڑھ سکے ہیں اور اس میں بھی ان کو اسی حد تک کامیابی ہو سکی ہے جس حد تک دو بالکل غیر متناسب چیزوں کے جوڑنے میں کسی شخص کو ہو سکتی ہے۔ بہرحال اس فن کی مدد سے اگر ممکن ہے تو صرف اس قدر ممکن ہے کہ آپ عربی شاعری کے بعض شعری محاسن کو متعین کر سکیں، قرآن مجید کے ادبی محاسن کو اس کی مدد سے متعین کرنا ناممکن ہے، بلکہ بہت بڑا اندیشہ اس بات کا ہے کہ اگر

آپ اس فن کو رہنما بنا کر قرآن کے محاسن کو متعین کرنے کے لیے نکلیں گے تو عجب نہیں آپ قرآن کو معجزہ ماننا تو درکنار اس کو ایک فصیح و بلیغ کتاب ماننے سے بھی انکار کر بیٹھیں. قرآن مجید ایک ایسا کلام ہے جو وحی کے سرچشمہ سے نکلا ہے، جو افصح العرب والعجم کی زبان پر جاری ہوا ہے، جس میں دریا کی روانی اور طوفان کا زور ہے، جس نے بجلی کے کڑکے کی طرح تمام عرب کی زمین ہلا ڈالی اور جس نے آناً فاناً ایک عالم کے دلوں اور دماغوں کو بدل ڈالا۔ ایک ایسی کتاب کی ادبی خوبیوں کو موجودہ فنِ بلاغت کے پیمانہ سے ناپنے کی کوشش کرنا ایسا ہی ہے جیسے گز لے کر آسمان کی پہنائیوں کو ناپنے کی کوشش کی جائے۔

میں اس موقع پر آپ کو نہایت مسرت کے ساتھ یہ اطلاع دیتا ہوں کہ اس موضوع پر مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب جمهرة البلاغۃ چھپ چکی ہے، جس میں مولانا نے قدیم فنِ بلاغت کی خامیوں پر نہایت تفصیل کے ساتھ تنقید کر کے قرآنی بلاغت کے جانچنے کے لیے اس کا ناکارہ ہونا ثابت کر دیا ہے اور ساتھ ہی وہ اصول بھی متعین کر دیے ہیں جو قرآن حکیم کی فصاحت و بلاغت کے جانچنے کے لیے معیار کا کام دے سکتے ہیں. اب اس سلسلہ میں اگر کوئی کام باقی ہے تو یہ ہے کہ مولانا نے جو اصول قائم کر دیے ہیں، قرآن مجید کے تدبّر اور عرب جاہلیت کے خطباء و شعراء کے کلام کے تتبّع سے ان اصولوں کے زیادہ سے زیادہ نظائر و شواہد جمع کر دیے جائیں تاکہ اس فن کا مطالعہ کرنے والے آسانی کے ساتھ اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے کہ ادھر تھوڑے سے عرصہ میں ادبِ جاہلی کا ایک اچھا خاصا حصہ چھپ کر شائع ہو چکا ہے جو اس کام میں اہلِ علم کی بڑی مدد کر سکتا ہے۔

نظمِ قرآن :

قرآن مجید کے سمجھنے میں دوسری چیز جس کا اہتمام ناگزیر ہے اور جو صحیح تاویل کے تعین

میں ایک فیصلہ کن عامل ہے وہ کلام کا نظم ہے۔ نظم کا مطلب یہ ہے کہ ہر سورہ کا ایک خاص عمود یا موضوع ہوتا ہے اور سورہ کی تمام آیتیں نہایت حکیمانہ مناسبت اور ترتیب کے ساتھ اس موضوع سے متعلق ہوتی ہیں۔ سورہ کے بار بار مطالعہ سے جب سورہ کا عمود واضح ہو جاتا ہے اور سورہ کی آیات کا تعلق بھی اس عمود کے سامنے آجاتا ہے تو پوری سورہ متفرق آیات کا ایک مجموعہ ہونے کے بجائے ایک نہایت حسین وحدت بن جاتی ہے۔ قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے اس نظم کو سمجھنا اوّلین چیز ہے۔ جب تک یہ نظم سمجھ میں نہ آئے اس وقت تک نہ تو کسی سورہ کی اصلی قدر و قیمت اور اس کی اصل حکمت ہی واضح ہوتی ہے اور نہ اس سورہ کی متفرق آیات کی صحیح تاویل ہی متعین ہوتی ہے۔ لیکن یہ چیز نہایت مشکل ہے، اس وجہ سے ہمارے مفسرین نے اس کی طرف بہت کم توجہ کی ہے اور جنہوں نے اس کی طرف توجہ بھی کی ہے تو محض سرسری توجہ کی ہے اس وجہ سے وہ اس سلسلہ میں کوئی مفید خدمت نہیں انجام دے سکتے ہیں۔ بلکہ جس قسم کا تعلق انہوں نے ایک سورہ کی متفرق آیات میں دکھایا ہے وہ سراسر تکلّف معلوم ہوتا ہے۔ اس قسم کا تعلق ہر دو مختلف چیزوں میں جوڑا جا سکتا ہے، خواہ وہ ایک دوسرے سے کتنی ہی غیر متعلق کیوں نہ ہوں۔ نظمِ قرآن سے ہماری مراد اس قسم کا تکلّفانہ نظم نہیں ہے، بلکہ وہ نظم مراد ہے جو کسی بہتر سے بہتر حکیمانہ مضمون میں ہو سکتا ہے اور جس کو مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر نظام القرآن کے اجزاء میں کھولا ہے۔

چونکہ عام طور پر علمائے تفسیر نے اس کی طرف بہت کم توجہ کی ہے، بلکہ بہتوں نے تو قرآن مجید کی بے نظمی ہی کو اس کا ہنر قرار دیا ہے، اس لیے بہت سے لوگ نظم کی تلاش کو ایک غیر ضروری کاوش قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ قرآن مجید میں نظم کو تلاش کرنا 'کوہ کندن کاہ برآوردن' کا مصداق ہے۔ قرآن مجید کی ہر سورہ متفرق نصیحتوں اور متفرق احکام کا مجموعہ ہے اور یہی چیز سامنے رکھ کر اس کی تلاوت کرنی چاہیے۔ ظاہر

ہے کہ اس خیال کے لوگ ـــــ اور اسی خیال کے لوگوں کی اکثریت ہے ـــــ اس محنت و کاوش کو برداشت نہیں کر سکتے جو نظم کی تلاش کے لیے ضروری ہے۔ اس وجہ سے سب سے مقدم یہ ہے کہ لوگوں کے اندر اس بات کا یقین پیدا کیا جائے کہ قرآن کے اندر نظم فی الواقع موجود ہے۔ چنانچہ میں پہلے نظم کے بعض دلائل بیان کردوں گا۔

۱۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی غلط فہمی جو دور ہونی چاہیے وہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں نظم کا دعویٰ کرنے والے اہلِ علم صرف اسی زمانہ میں ظہور میں نہیں آئے ہیں، بلکہ پہلے بھی لوگوں نے اس کا دعویٰ کیا ہے اور بعض نے نظم قرآن پر کتابیں بھی لکھی ہیں۔ چنانچہ علامہ سیوطیؒ الاتقان فی علوم القرآن میں لکھتے ہیں:

افرد بالتالیف العلامة ابوجعفر بن الزبیر شیخ ابوحیان فی کتاب سماه: البرهان فی مناسبة ترتیب سور القرآن ومن اهل العصر الشیخ برهان الدین البقاعی فی کتاب سماه: نظم الدرر فی تناسب الآی والسور۔[1]	علامہ ابوجعفر بن زبیر شیخ ابوحیان نے نظم قرآن پر ایک خاص کتاب لکھی اور اس کا نام 'البرہان فی مناسبۃ ترتیب سور القرآن' رکھا اور ہمارے ہم عصروں میں سے شیخ برہان الدین بقاعی کی تفسیر 'نظم الدرر فی تناسب الآی والسور' بھی اسی اصول پر لکھی گئی ہے۔

علامہ سیوطیؒ نے خود اپنی ایک کتاب کا بھی ذکر کیا ہے، جس میں انہوں نے نظم قرآن کے علاوہ قرآن کے معجز ہونے کے پہلو بھی واضح کیے ہیں اور اسی سلسلہ میں نظمِ قرآن کی اہمیت کا وہ ان الفاظ میں اعتراف کرتے ہیں:

علم المناسبة علم شریف قل اعتناء المفسرین به لدقته و	ترتیب اور نظم کا علم ایک نہایت اعلیٰ علم ہے لیکن اس کے مشکل ہونے کے سبب

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن: ج ۲، ص ۱۰۸

ممن اکثر منه الامام فخر الدین فقال فی تفسیرہ: اکثر لطائف القرآن مودعة فی الترتیبات والروابط۔[1]	سے مفسرین نے اس کی طرف بہت کم توجہ کی ہے۔ امام فخر الدین کو اس چیز کا سب سے زیادہ اہتمام رہا ہے اور ان کا کہنا یہ ہے کہ حکمتِ قرآن کا اصل خزانہ اس کے نظم و ترتیب میں چھپا ہوا ہے۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں نظمِ قرآن کی طرف خاص طور پر توجہ کی ہے، اگرچہ اس سلسلہ میں ان کی کوششیں کچھ زیادہ مفید نہیں ثابت ہوئیں، کیونکہ نظمِ قرآن کھولنے کے لیے جو محنت درکار تھی اس کے لیے اُن کے جیسے مصروف مصنّف کے پاس فرصت مفقود تھی۔ تاہم اس چیز کی اہمیت وہ جس قدر محسوس کرتے تھے اس کا اظہار انہوں نے جگہ جگہ اپنی تفسیر میں کیا ہے۔ چنانچہ وہ آیت 'وَلَوْ جَعَلْنٰہُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا...' (حٰمٓ السجدۃ) کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

نقلوا فی سبب نزول هذه الآیة ان الکفار لاجل التعنت، قالوا لونزل القرآن بلغة العجم فنزلت هذه الآیة، وعندی ان امثال هذه الکلمات فیها حیف عظیم علی القرآن لانه یقتضی ورود آیات لاتعلق للبعض فیها بالبعض وانه یوجب اعظم انواع الطعن فکیف یتم مع التزام مثل هذا الطعن	لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیت ان لوگوں کے جواب میں اتری ہے جو از راہِ شرارت یہ کہتے تھے کہ اگر قرآن مجید کسی عجمی زبان میں اتارا جاتا تو بہتر ہوتا، لیکن اس طرح کی باتیں کہنا میرے نزدیک کتابِ الٰہی پر سخت ظلم ہے۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ قرآن کی آیتوں میں باہم دگر کوئی ربط و تعلق نہیں ہے حالانکہ یہ کہنا قرآنِ حکیم پر بہت بڑا اعتراض کرنا ہے ایسی صورت میں قرآن کو معجزہ

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن: ج ۲، ص ۱۰۸

ادعاء كونه كتابا منتظما، فضلا عن ادعاء كونه معجزًا؟ بل الحق عندي ان هذه السورة من اولها الى آخرها كلام واحد[1].

ماننا تو الگ رہا اس کو ایک مرتب کتاب کہنا بھی مشکل ہے۔ میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ یہ سورہ شروع سے لے کر آخر تک ایک مربوط کلام ہے۔

اس کے بعد تقریباً انیس سطروں میں آیت کی اجمالی تفسیر لکھ کر فرماتے ہیں:

وكل من انصف ولم يتعسف علم انا اذا فسرنا هذه الآية على الوجه الذي ذكرناه صارت هذه السورة من اولها الى آخرها كلامًا واحدًا منتظمًا مسوقًا نحو غرض واحد[2].

ہر مصنف، جو انکارِ حق کا عادی نہیں ہے، تسلیم کرے گا کہ اگر سورہ کی تفسیر اس طرح کی جائے جس طرح ہم نے کی ہے تو پوری سورہ ایک ہی مضمون کی حامل نظر آئے گی اور اس کی تمام آیتیں ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ کریں گی۔

اس سلسلہ کی ایک نہایت اہم شخصیت علامہ مخدوم مہائمی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ جن کی تفسیر 'تبصیر الرحمٰن و تیسیر المنان' تفسیر مہائمی کے نام سے نہایت مشہور ہے۔ اس تفسیر میں انہوں نے اپنی کوشش کی حد تک 'آیاتِ قرآن کا نظم بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ الگ سوال ہے کہ اس میں ان کو کامیابی ہوئی ہے یا نہیں؟ اور اگر ہوئی ہے تو کس حد تک ہوئی ہے؟

اسی مسلک کے ایک بزرگ علامہ ولی الدین ملوی ہیں۔ قرآن کے نظم سے متعلق ان کا ارشاد یہ ہے:

'جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ قرآن مجید کا نزول چونکہ حالات کے تقاضے

---

1. التفسير الكبير: ج ۲۷، ص ۱۳۳
2. التفسير الكبير: ج ۲۷، ص ۱۳۴

کے مطابق تھوڑا تھوڑا کر کے ہوا ہے، اس وجہ سے اس میں نظم نہیں تلاش کرنا چاہیے ان کو سخت دھوکا ہوا ہے۔ قرآن مجید کا نزول بلاشبہ حسبِ حالات جستہ جستہ ہوا ہے، لیکن جس طرح اس کو ترتیب دیا گیا ہے اس میں نہایت گہری حکمت ملحوظ ہے'۔

مذکورہ بالا اقوال جو مشہور علمائے امت کے ہیں اس بات کی نہایت واضح شہادت ہیں کہ قرآن مجید میں نظم کے قائل صرف مولانا حمید الدین فراہی رحمتہ اللہ علیہ یا ان کے تلامذہ ہی نہیں ہیں، بلکہ ان سے پہلے دوسرے علماء نے بھی اس چیز کو محسوس کیا ہے اور اس کی شہادت دی ہے۔

پھر ایک بڑا قابلِ لحاظ پہلو اس بحث میں یہ ہے کہ جن علماء نے نظم کا انکار کیا ہے انہوں نے بھی اس کی ضرورت اور کلام میں اس کی اہمیت محسوس کی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جو علماء نظم کے قائل نہیں ہیں وہ بھی اکثر کسی تاویل کی تائید وحمایت میں کلام کے سیاق وسباق کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ کلام کے سیاق وسباق کو دلیل میں اسی وقت پیش کیا جا سکتا ہے جب اس کو ایک منظّم کلام مانا جائے۔ مشہور تفسیروں میں سے یہ چیز ابنِ جریرؒ کی تفسیر میں بھی موجود ہے اور صاحبِ کشاف کے یہاں بھی یہ چیز پائی جاتی ہے۔ یہ دونوں حضرات اکثر جگہ کسی آیت کی مختلف تاویلات میں سے اس تاویل کو ترجیح دیتے ہیں جو ان کو نظمِ کلام سے زیادہ مناسبت رکھنے والی نظر آتی ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ یہ حضرات نظمِ قرآن کو اس کے اشکال کی وجہ سے ہر جگہ کھولنے کا التزام نہ کر سکے، لیکن جہاں کہیں نظم سے استدلال ممکن ہوا ہے انہوں نے اس کو ایک کلام کی بدیہی خصوصیت مان کر اس کو دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ امام رازیؒ کا ذکر ہم یہاں اس لیے نظر انداز کرتے ہیں کہ نظمِ قرآن کے معاملہ میں وہ مذکورہ بالا دونوں بزرگوں سے بالکل مختلف حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ نظم کی ضرورت واہمیت کے، جیسا کہ اُن کے اُن اقوال سے واضح ہے جو اوپر نقل کر آئے ہیں، نہایت شدّت کے ساتھ قائل ہیں اور ہر آیت کے تحت

اس کو بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں اگرچہ، جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں، ان کو اس کوشش میں کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی ہے۔

جو لوگ نظمِ قرآن کا اپنی خواہش کے بالکل خلاف انکار کرنے پر مجبور ہوئے ہیں انہوں نے اس انکار کے لیے جو دلیل دی ہے وہ اس قدر کمزور دلیل ہے کہ دوسرے تو درکنار وہ خود بھی اس سے مطمئن نہیں ہو سکتے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ قرآن مجید ضرورت اور حالات کے لحاظ سے تھوڑا تھوڑا کر کے اترا ہے، اس وجہ سے اس میں کوئی نظم نہیں ہے۔ یہ دلیل محض اس امر واقع سے ٹوٹ جاتی ہے کہ لمبی سورتوں میں سے بعض اور چھوٹی سورتوں میں سے اکثر پوری پوری ایک ہی دفعہ میں نازل ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان سورتوں کی بے نظمی کی توجیہ مذکورہ بالا دلیل سے نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اسی بنا پر ان حضرات کے خلاف امام رازیؒ نے وہ اعتراض اٹھایا ہے جو ہم اوپر نقل کر آئے ہیں۔

ہمارے نزدیک ان حضرات کے انکار کی وجہ کوئی دلیل نہیں ہے، بلکہ محض یہ چیز ہے کہ انہوں نے خیال کیا کہ قرآن میں نظم کا دعویٰ کرنا اور پھر اس کو ہر جگہ کھول نہ سکنا ایک بڑی کمزوری کی بات ہوگی، اس سے مخالفینِ اسلام قرآن پر اعتراض کرنے کی ایک راہ پالیں گے اور یہ بات امت کے حق میں مضر ہوگی۔ اس چیز سے بچنے کے لیے انہوں نے یہی مناسب خیال کیا کہ سرے سے نظم ہی کا انکار کر دیں۔ اگرچہ انہوں نے یہ بات نیک نیتی سے کی، لیکن اس میں شبہ نہیں ہے کہ اس کا ضرر اس چیز کے ضرر سے کہیں زیادہ ہے جس سے قرآن کو بچانے کے لیے ان حضرات نے یہ راہ اختیار کی۔ اس معاملہ میں صحیح راہ یہ تھی کہ جس حد تک نظم کو واضح کر سکتے اس حد تک واضح کرنے کی کوشش کرتے اور جہاں نہ واضح کر سکتے وہاں اپنے قصورِ علم کا اعتراف کر لیتے، نہ کہ کلام کے ایک صریح عیب کو اس کا ہنر ثابت کرنے کی کوشش کرتے۔

۳۔ جن لوگوں نے قرآن کے جمع و ترتیب سے متعلق روایات پر غور کیا ہے وہ اس

امرِ واقعہ سے انکار نہیں کر سکتے کہ قرآن اگرچہ نازل تو جستہ جستہ ہوا ہے، لیکن آیات کی ترتیب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق ہوئی ہے۔ جو آیات اُترتیں آپ خود سورتوں کے اندر ان کی جگہ متعین فرماتے اور کاتبینِ وحی کو حکم دیتے کہ ان آیتوں کو فلاں سورہ میں فلاں مقام پر رکھو اور کاتبینِ وحی آپ کی ہدایت کے مطابق ان آیات کو ان کی متعین جگہوں میں رکھتے۔ چنانچہ اس بات پر تمام امت کا اتفاق ہے کہ آیات کی ترتیب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق ہوئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر قرآن مجید میں نظم نہیں ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس قسم کا حکم کیوں دیتے ہیں؟ پھر تو بہتر ترتیب نزولی ترتیب ہوتی؟ جس ترتیب سے آیتیں اترتی جاتیں اسی ترتیب سے ان کو رکھواتے چلے جاتے؟ جب نزولی ترتیب چھوڑ کر ایک خاص ترتیب اختیار کی گئی تو اس امر پر غور کرنا پڑے گا کہ آخر اس نئی ترتیب کو اختیار کرنے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا صحیح جواب ایک ہی ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ ترتیب مضامین کی مناسبت کے لحاظ پر قائم ہے۔ اوپر علامہ ملوی رحمۃ اللہ علیہ کا جو قول ہم نقل کر آئے ہیں اس سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

ہمارے اس خیال کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ قرآن مجید کے کسی حکم کے نازل ہونے کے بعد اگر کوئی ایسی آیت اتری جس میں اس حکم کے بارہ میں اللہ تعالےٰ نے کسی تخفیف یا ترمیم کا حکم دیا تو وہ آیت، خواہ سابق اصلی حکم کے کتنے ہی طویل زمانہ کے بعد نازل ہوئی ہو، لیکن بالعموم اس کو اس سابق حکم ہی کے پہلو میں جگہ دی گئی۔ اس کی متعدد مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں اور اگر کہیں اس اصول کی خلاف ورزی کی گئی ہے تو نظمِ کلام اور مناسبتِ مضمون کی اصولی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔

۴۔ قرآن مجید میں الگ الگ سورتوں کا قائم کیا جانا اور ان میں سے کسی کا بڑا اور کسی کا چھوٹا ہونا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن مجید میں نظم ہے۔ اگر قرآن مجید

ایک غیر منظم کتاب ہے تو یہ الگ الگ سورتیں قائم کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ ہر صاحبِ عقل اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ اگر سورتوں کے مضامین الگ الگ نہ ہوتے اور ہر سورہ ایک مخصوص وحدانیت اور ایک خاص عمود کی حامل نہ ہوتی تو تلاوت اور حفظِ قرآن کے نقطۂ نظر سے سب سے زیادہ آسان ترتیب یہ ہوتی کہ جامعینِ قرآن آیتوں کے مجموعے لیتے اور ان کو برابر سورتوں میں رکھتے چلے جاتے۔ لیکن جب انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ الگ الگ سورتیں قائم کیں جن میں کوئی بڑی ہے اور کوئی چھوٹی تو اس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ ان سورتوں کے مضامین الگ الگ ہیں اور ان میں سے ہر ایک خاص وحدانیت اور خصوصیت کی حامل ہے۔

۵- سورتوں کی موجودہ ترتیب بھی جو تمام مصاحف میں یکساں طور پر، بغیر کسی اختلاف کے پائی جاتی ہے اس بات کی بہت بڑی دلیل ہے کہ قرآن مجید ایک منظم کتاب ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن مجید کی سورتوں کی ترتیب میں جو تقدیم و تاخیر پائی جاتی ہے وہ بلا کسی سبب کے نہیں ہو سکتی، اس لیے اس سوال پر غور کرنا پڑے گا کہ یہ تقدیم و تاخیر کس اصول پر مبنی ہے؟ ظاہری طور پر سورتوں کے بڑے چھوٹے ہونے کو اس تقدیم و تاخیر میں سب سے زیادہ دخل ہونا چاہیے تھا، لیکن قرآن مجید پر ایک نگاہ ڈال کر ہر شخص اس بات کا اندازہ کر سکتا ہے کہ اس چیز کا قرآن میں ذرا بھی لحاظ نہیں کیا گیا ہے، کیونکہ ترتیب میں سورۂ فاتحہ کو سورۂ بقرہ سے پہلے جگہ دی گئی ہے حالانکہ دونوں کی مقدار میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ اسی طرح سورۂ کوثر جو قرآن مجید کی سب سے چھوٹی سورہ ہے، ایسی متعدد سورتوں سے پہلے رکھی گئی ہے جو مقدار میں اس سے بڑی ہیں۔ یہ بھی مسلم ہے کہ یہ ترتیب نزولی بھی نہیں ہے کیونکہ اس ترتیب کے اعتبار سے، مشہور روایت کے لحاظ سے قرآن میں سب سے پہلے سورۂ اقراء کو جگہ ملنی چاہیے تھی۔ لیکن ہر شخص کو معلوم ہے کہ سورۂ اقراء آخری پارہ میں رکھی گئی ہے۔ یہ صورت حال آدمی کو مجبور کرتی ہے کہ وہ

مقدار اور ترتیبِ نزول کے سوا اس تقدیم و تاخیر کا کوئی اور سبب تلاش کرے۔ ہمارے نزدیک اس تقدیم و تاخیر کی وجہ سورتوں میں باہم دگر معنوی مناسبت کا لحاظ ہے۔ ممکن ہے ہمارے اس دعویٰ پر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ سورتوں کی ترتیب تو صحابہؓ کے زمانہ میں ہوئی ہے، اس لیے اس ترتیب کے اسرار پر غور کرنا ہی ایک فضول کام ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اول تو سورتوں کی ترتیب، جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ہوئی ہے۔ ثانیاً اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ سورتوں کی ترتیب صحابہؓ کی رائے سے ہوئی ہے، تو اس سے یہ کیونکر لازم آیا کہ صحابہؓ نے سورتوں کو یوں ہی بغیر کسی معنوی مناسبت کے، جمع کر دیا۔ درآنحالیکہ اس بات سے ہر شخص واقف ہے کہ سورۂ توبہ کے بارہ میں جب صحابہؓ میں اختلاف ہوا کہ اس کو کس جگہ رکھا جائے تو یہ گتھی بالآخر نظم ہی کی مدد سے سلجھی اور معنوی مناسبت کے سبب سے اس کو سورۂ انفال کے بعد جگہ دی گئی۔

یہ بات ہم نے ان لوگوں کا خیال پیش نظر رکھ کے کہی ہے جو کہتے ہیں کہ سورتوں کی ترتیب صحابہؓ کے زمانہ میں انہی کی رائے سے ہوئی ہے، ورنہ ہمارے نزدیک، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، سورتوں کی ترتیب بھی ہدایتِ الٰہی کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔ ہمارے اس دعویٰ کی تائید قرآن اور احادیث، دونوں سے ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سورۂ قیامہ میں ارشاد فرمایا ہے:

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۚ	ہمارے ذمہ ہے اس کو جمع کرنا اور
فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ	اس کو سنانا تو جب ہم اس کو سنا
قُرْاٰنَهٗ ۚ ثُمَّ اِنَّ	چکیں تو اس سنانے کی پیروی کرو،

عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ط پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کی
(القیٰمۃ - ۱۷ : ۱۹) وضاحت کرنا۔

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"اس آیت میں تین باتیں بیان کی گئی ہیں - ایک یہ کہ قرآن مجید عہد نبوت ہی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ جمع کر کے سنا دیا جائے گا۔ کیونکہ یہ وعدہ اگر آپ کے بعد پورا ہونے والا ہوتا تو آپ کو اس جمع و ترتیب کی پیروی کا حکم نہ دیا جاتا۔

دوسری یہ کہ اس قرارتِ ثانیہ کے مطابق، جو جمع کے بعد ہوئی ہے، آپ کو حکم ہوا کہ آپ امت کو قرآن مجید سنائیں اور یہ بات عقلاً و نقلاً ناممکن ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی حکم بغرض تبلیغ آئے اور آپ اس کو امت تک نہ پہنچائیں - قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ: "يَاۤ اَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ط وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ (المآئدۃ - ۵ : ۶۷) (اے رسول! تمہاری طرف جو چیز تمہارے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے اس کو اچھی طرح پہنچا دو، اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اس کے پیغام کو نہیں پہنچایا) - اس حکم عام کا تقاضا یہ ہے کہ اس قراءتِ اخیرہ کے مطابق جو لوحِ محفوظ میں ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو قرآن مجید سنایا ہو۔ اس آخری قراءت کا اصل کے مطابق ہونا ضروری ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اس جمع و ترتیب کے بعد اگر اللہ تعالیٰ نے کسی حکمِ عام کو خاص یا کسی حکمِ خاص کو عام کرنا چاہا یا کسی بات کی تکمیل کرنی چاہی تو یہ ساری باتیں بھی کر دیں۔

قرآن مجید ان تمام مراحل سے عہدِ نبوت ہی میں گزر گیا۔ اس حقیقت سے ہر شخص واقف ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو پوری پوری سورتیں سناتے تھے اور یہ بات بغیر اس کے ناممکن ہے کہ قرآن مجید ایک خاص ترتیب کے ساتھ آپ کو سنایا گیا ہو۔ اسی ترتیب کے مطابق صحابہؓ نے آپ سے قرآن مجید سیکھا۔ روایات میں اس بات کی تصریح ہے کہ آپ آیات کو مناسب جگہوں میں رکھنے کی ہدایت فرماتے تھے اور آپ کے اس حکم کی تعمیل کی جاتی تھی۔ اگر بعد میں کوئی تشریحی آیت اترتی تو وہ مناسب جگہ میں رکھ دی جاتی۔ اس طرح جب پورا قرآن مجید مکمل ہو گیا تو حضرت جبریلؑ نے، جیسا کہ صحیح احادیث میں بیان کیا گیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری مرتبہ پورا قرآن سنایا۔

اس حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد نظامِ قرآن کی بہت سی مشکلات خود بخود حل ہو جاتی ہیں[1]۔

استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کی مذکورہ بالا تحقیق سے، جو انہوں نے خود قرآن سے اخذ کی ہے، یہ بات قطعی طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید جس ترتیب کے ساتھ ہمارے زمانہ میں موجود ہے، یہ ترتیب اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق عہدِ نبوت ہی میں مکمل ہو چکی تھی، لیکن چونکہ اس زمانہ میں عربوں میں لکھنے پڑھنے کا رواج کم تھا اور کاغذ وغیرہ بھی نہایت کمیاب تھا، اس وجہ سے ایک عرصہ تک قرآن مجید کھجور کے پتوں، ہڈیوں، تختیوں اور حفاظ کے سینوں ہی میں رہا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے ترتیبِ نبوی کے مطابق منتشر آیات کو ایک مصحف میں جمع کیا اور پھر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں اس نسخہ کی متعدد نقلیں کرا کے ان کو ممالکِ اسلامیہ کے مختلف حصوں

---

[1] تفاسیرِ فراہی: تفسیر سورۂ قیامہ

میں سمجھوایا۔

۶۔ قرآن مجید کے منظم ہونے کی ایک بہت بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ قرآن مجید مسلّم طور پر ایک اعلیٰ کلام ہے اور کوئی کلام جو نظم سے خالی ہو وہ اعلیٰ کلام نہیں ہو سکتا۔ کسی کلام کی اصلی روح اس کا نظم ہوتا ہے۔ نظم کو الگ کر دینے کے بعد کلام نہ صرف یہ کہ اپنی بعض ادبی خوبیوں سے محروم ہو جاتا ہے بلکہ پورا کلام بالکل مہمل اور بے معنی ہو کے رہ جاتا ہے۔ جو کلام نظم سے خالی ہو لوگ اس کو از قبیلِ خرافات سمجھتے ہیں اور کم از کم کوئی عاقل آدمی تو اس پر وقت صرف کرنا پسند نہیں کرتا۔ قرآن مجید کی نسبت تمام دنیا کو علم ہے کہ اس نے عربوں کو چیلنج کیا کہ وہ اس کے مانند کوئی ایک سورہ پیش کریں، لیکن اہل عرب اس تمام فخر و ناز کے باوجود جو ان کو اپنی فصاحت و بلاغت پر تھا، اس کے چیلنج کے جواب میں کوئی چھوٹی سے چھوٹی سورہ بھی پیش نہ کر سکے۔ قرآن مجید کی اس ادبی و معنوی عظمت کے لحاظ سے سب سے پہلی چیز جو اس میں ہونی چاہیے وہ نظم ہے۔ کیونکہ ایک ایسی کتاب جو سب سے زیادہ منتشر اور بے نظم خیال کی جاتی ہو وہ فصحائے عرب کو کبھی مرعوب نہیں کر سکتی تھی۔

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ قرآن کے اس چیلنج میں سب سے بڑی چیز جو فصحائے عرب کے چھکے چھڑا دینے والی تھی، درحقیقت اس کا معجزانہ نظمِ کلام ہی تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ قرآن مجید نے جہاں کہیں عربوں کو چیلنج کیا ہے ان سے اپنی مثل ایک کتاب یا دس سورتیں یا حدیث من مثلہ، یا کم از کم ایک سورہ پیش کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ اس سے کم کا مطالبہ نہیں کیا ہے۔ کیونکہ اس سے کم میں کلام کا حسنِ نظم واضح نہیں ہو سکتا جو درحقیقت اس کی اصلی جان ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے عرب و عجم کے تمام علمائے بلاغت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کلام کی اصلی روح اس کا نظم ہے، اسی سے اس کی تمام خوبیاں ظہور میں آتی ہیں۔ اگر کسی شخص کو اس

حقیقت کے تسلیم کرنے میں تامل ہو تو وہ کسی بلیغ خطیب کے کلام کو لے کر اس کے نظم کو درہم برہم کردے۔ اس کلام کا سارا زور دفعتہً غائب ہو جائے گا۔

نظمِ قرآن کی یہ چند دلیلیں میں نے محض اس خیال سے پیش کی ہیں کہ آپ حضرات میں سے اگر کسی کو یہ غلط فہمی ہو کہ قرآن مجید ایک منتشر اور بے نظم کتاب ہے اور اس کی بے نظمی ہی اس کا اصلی وصف ہے تو یہ غلط فہمی رفع ہو جائے اور آپ پورے اعتماد کے ساتھ نظم کو فہمِ قرآن میں رہنما بنا سکیں۔

تلاشِ نظم کے اصول:

لیکن نظمِ قرآن کے دلائل بیان کرنے سے زیادہ ضروری تو یہ ہے کہ وہ اصول بتائے جائیں جو تلاشِ نظم میں رہنما کا کام دے سکیں۔ کوئی شخص نظم کا انکار اس لیے نہیں کرتا کہ اس کو اس کی اہمیت کا اعتراف نہیں ہے یا اس کے وجود کے دلائل اس پر واضح نہیں ہوئے ہیں، بلکہ اس کے انکار کی اصلی وجہ یہ ہے کہ نظم کی تلاش اور اس کا تعین ہے بڑا مشکل کام۔ اگر یہ مشکل کسی طرح آسان ہو جائے تو اس کی قدر و قیمت اور فہمِ کلام میں اس کی کلیدی اہمیت سے کسی کو بھی انکار کی گنجائش نہیں ہے۔

میرے لیے اس مختصر صحبت میں تلاشِ نظم کے اصول بیان کرنا بڑا مشکل ہے، بلکہ اصل یہ ہے کہ اس طرح کی متعدد صحبتیں بھی اس مقصد کے لیے کافی نہیں ہو سکتی ہیں۔ اس کے لیے صحیح طریقہ صرف یہ ہے کہ پوری تفصیل کے ساتھ آپ کو پہلے وہ اصول بتلائے جائیں جو نظمِ قرآن کی تلاش میں آپ کی رہنمائی کر سکتے ہیں اور پھر ان اصولوں کے استعمال کرنے کی آپ کو مشق کرائی جائے۔ جہاں تک اصولوں کے معلوم کرنے کا تعلق ہے وہ تو آپ اس دور کے سب سے بڑے خادمِ قرآن مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات کے مطالعہ سے کر سکتے ہیں۔ بالخصوص ان کی کتاب 'دلائل النظام' اگر چھپ جائے تو توقع

ہے کہ جہاں تک اصول کے معلوم کرنے کا تعلق ہے۔ اہل علم کے لیے کوئی مشکل باقی نہیں رہ جائے گی۔ لیکن ان اصولوں کو برتنا اور ان سے فائدہ اٹھانا آپ کے شوقِ علم اور ذوقِ جستجو پر منحصر ہے۔

میں اس صحبت میں جو خدمت کرسکتا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ بعض ایسے اشارات کردوں جو تلاشِ نظم میں آپ کی رہنمائی کرسکیں۔ میرے خیال میں تلاشِ نظم میں تین چیزوں کی وجہ سے سب سے زیادہ مشکلیں پیش آیا کرتی ہیں۔ اس لیے انہی کی نسبت میں بعض مفید اشارات یہاں کروں گا۔ اگر آپ نے ان سے فائدہ اٹھایا تو آپ بہت سی مشکلوں کو حل کرلیں گے۔

سب سے پہلی چیز جس کے سبب سے لوگ عموماً نظمِ قرآن سے مانوس نہیں ہوتے وہ قدیم عربی ادب کی خصوصیات سے ناآشنائی ہے۔ عربی زبان میں اطناب وایجاز اور طول و اختصار کے جو قاعدے ہیں اور جن کو عرب کے فصحاء نہایت آزادی کے ساتھ برتتے ہیں، ہم اپنی زبان میں عام طور پر ان چیزوں سے اچھی طرح مانوس نہیں ہیں۔ اس وجہ سے جب قرآن میں ان سے سابقہ پیش آتا ہے تو وہ ہماری گرفت میں نہیں آتیں۔ اعلیٰ عربی ادب سے جن لوگوں کو سابقہ رہا ہے وہ جانتے ہیں کہ عربی زبان میں کس طرح بات ایک خاص نقطہ سے شروع ہوتی ہے اور پھر بات میں بات پیدا ہوتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ ایک حد تک پہنچ کر کلام پھر اپنے اصل مرکز کی طرف لوٹ آتا ہے۔ ایک طرف یہ پھیلاؤ ہوتا ہے دوسری طرف اسی کے اندر ایجاز و اختصار کے گوناگوں پہلو ملحوظ ہوتے ہیں۔ جن سے صرف عربی ادب کے ماہرین ہی آشنا ہوتے ہیں، دوسرے لوگ ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔

ایک دعویٰ آتا ہے اور معاً اس کے ساتھ اس کی دلیل مذکور ہوتی ہے لیکن یہ نہیں واضح کیا جاتا کہ یہ اس کی دلیل ہے، بلکہ یہ چیز محض موقع کلام کی دلالت پر اعتماد کرکے چھوڑ دی جاتی ہے۔ اسی طرح ایک جواب دے دیا جائے گا اور یہ نہیں واضح کیا جائے گا کہ

یہ فلاں اعتراض یا فلاں شبہ کا جواب ہے۔ اس چیز کو بھی سیاقِ کلام یا مخاطب کی ذہانت کے بھروسہ پر نظر انداز کر دیا جائے گا۔ بسا اوقات ایک خاص سلسلۂ کلام کے اندر ایک بات بطور التفات یا بطور جملۂ معترضہ کے آجائے گی اور کبھی کبھی وہ اتنی دراز ہو جائے گی کہ اگر مخاطب اچھی طرح متنبہ نہ رہے تو سررشتۂ کلام ہی اس کے ہاتھ سے جاتا رہے۔ ایک داستان بیان ہوگی اور اس کے اندر کے وہ سارے حصے چھوڑ دیے جائیں گے جن کو ایک ذہین سامع کو خود بخود جوڑ لینا چاہیے۔ بسا اوقات کچھ خاص نتائج کو پیش نظر رکھ کر ایک بات کہہ دی جائے گی اور یہ نہیں واضح کیا جائے گا کہ یہ بات کن خاص نتائج کو پیشِ نظر رکھ کر یہاں کہی گئی ہے۔

اس طرح کے بے شمار پہلو ہیں جن سے آدمی اس وقت تک اچھی طرح مانوس نہیں ہوتا جب تک قدیم ادبِ عربی اور خطبائے جاہلیت کے کلام سے اسے اچھی طرح واقفیت نہ ہو اور قرآن چونکہ اعلیٰ ادبِ عربی کی تمام پاکیزہ خصوصیات کا حامل ہے۔ اس لیے ان چیزوں کی ناواقفیت قرآن کے نظم کے سمجھنے میں مانع ہوتی ہے۔

دوسری چیز جس کے سبب سے نظمِ قرآن کے سمجھنے میں زحمتیں پیش آئی ہیں وہ یہ ہے کہ عموماً لوگ اس بات کا تعین نہ کر سکے کہ قرآنِ مجید کلام کی کونسی صنف ہے؟ یہ اس طرح کی کوئی تصنیف ہے جس طرح کی فنی تصنیفیں ہوا کرتی ہیں، یا یہ شاعروں کے کلام سے مشابہ ہے، یا کاہنوں کے کلام سے ملتی جلتی کوئی چیز ہے، یا یہ خطیبوں کے کلام کے طرز پر ہے؟ کفارِ عرب اس کو شعر اور کاہنوں کے سجع سے تشبیہ دیا کرتے تھے اور آج کل کے لوگ اس میں عموماً ایک فنی تصنیف کی خصوصیات ڈھونڈتے ہیں۔ حالانکہ ان باتوں میں سے کوئی بات بھی صحیح نہیں ہے۔ قرآن مجید اگر مذکورہ اصنافِ کلام میں سے کسی کلام سے مشابہت رکھتا ہے تو وہ خطبار کا کلام ہے۔ لیکن اس صنفِ کلام سے بھی اس کا تعلق صرف مشابہت ہی کے حد تک ہے۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ

یہ تمام تر خطبات کی خصوصیات کا حامل ہے۔

اس کو خطباء کے کلام سے مشابہ کہنے کا ہمارا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کی ہر سورہ اپنے ماحول سے نہایت گہرا تعلق رکھتی ہے۔ اس وجہ سے اس کو سمجھنے کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ پہلے اس ماحول کو سمجھنے کی کوشش کی جائے جس ماحول کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر وہ اتری ہے۔ اس ماحول کو سمجھنے کے لیے ہرگز قرآن مجید سے خارج کسی چیز کی مدد کی احتیاج نہیں ہوتی، یہ ماحول خود قرآن ہی کی روشنی میں منوّر ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ معیّن کرنا ضروری ہوتا ہے کہ وہ کیا تقاضے ہیں جو اس کلام کے داعی ہوئے ہیں۔ جب یہ تقاضے ٹھیک معیّن ہو جاتے ہیں تو اس پوری سورہ کا نظام ایسی خوبی اور ایسی وضاحت کے ساتھ سامنے آجاتا ہے اور کلام اپنے ماحول سے اس طرح وابستہ ہو جاتا ہے کہ ہر شخص بے تکلف پکار اٹھتا ہے کہ یہ جامہ اسی قامت کے لیے تراشا گیا تھا۔

جامہ بود کہ بر قامت او دوختہ بود

بعض لوگ ان تقاضوں کو معیّن کرنے میں شانِ نزول کی ان روایات سے مدد لیتے ہیں جو تفسیر کی کتابوں میں موجود ہیں۔ یہ طریقہ نہایت غلط ہے۔ شانِ نزول کی روایات نظمِ قرآن کو درہم برہم کرنے میں سب سے زیادہ دخل رکھتی ہیں اور ان کا بیشتر حصہ بے سروپا باتوں پر مشتمل ہے۔ اس لیے صحیح طریقہ صرف یہ ہے کہ آپ خود قرآن کے اشارات سے پس منظر کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ جب آپ یہ جان لیں گے کہ کلام کن لوگوں کو خطاب کر رہا ہے؟ جن لوگوں کو خطاب کر رہا ہے ان میں سے کن کی طرف اس کا خطاب براہِ راست اور کن کی طرف بالواسطہ ہے؟ کون سا مرحلہ ہے جس کے حالات سے مخاطب دوچار ہے اور اس مرحلہ نے کیا کیا سوالات اٹھا دیے ہیں جن کے جوابات کے دوست بھی منتظر ہیں اور دشمن بھی؟ نیز دشمنوں کی مخالفت کیا نوعیت اختیار کر چکی ہے اور دوست کس حال میں

ہیں ؟ مخالف صفوں میں کون کون سی پارٹیاں کن حربوں سے مسلح ہوکر آ شامل ہوئی ہیں اور موافقین کے مختلف گروہ کس طرز پر سوچ رہے ہیں ؟ تو خود بخود کلام کا سارا نظام آپ کے سامنے بے نقاب ہو جائے گا۔ یہ ساری باتیں خود فحوائے کلام کے اندر بول رہی ہوتی ہیں۔ اس لیے اگر محنت کر کے ان کو معیّن کر لیا جائے تو نظمِ کلام آپ سے آپ کھلتا چلا جاتا ہے اور قرآن کی ایک سورہ پڑھ کر دل پر وہی اثر طاری ہوتا ہے جو اثر ایک بہترین خطیب کے ایک بہترین مناسبِ حال خطبہ کو سن کر دل پر طاری ہوتا ہے۔

اس سلسلہ کی تیسری مشکل تعیینِ خطاب کی مشکل ہے۔ قرآن مجید پر تدبّر کرنے والا جس چیز سے سب سے زیادہ الجھن محسوس کرتا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے، بلکہ بسا اوقات ایک ہی آیت کے اندر خطاب بدلتا رہتا ہے۔ ابھی خطاب مسلمانوں سے تھا ابھی مشرکین سے ہو گیا، ابھی ذکر اہلِ کتاب کا چل رہا تھا کہ دفعتہً مسلمان مخاطب ہو گئے، ابھی خطاب واحد کے صیغہ سے تھا، فوراً جمع کے صیغہ میں ہو گیا۔ اسی طرح خود مصدرِ خطاب بھی بدلتا رہتا ہے۔ ابھی خطاب براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا کہ دفعتہً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہو گیا۔ ابھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کوئی بات کہی جا رہی تھی کہ دفعتہً کوئی بات حضرت جبریل امینؑ کی زبان سے تراوش ہوئی۔ مخاطب اور متکلم کی یہ تبدیلیاں ایک نومشق آدمی کو بہت پریشان کرتی ہیں اور اس قدر تیزی کے ساتھ جو تبدیلیاں واقع ہوں، ان کے ساتھ سررشتۂ نظم کو سنبھالنا بڑا مشکل ہے۔

تبدیلیِ خطاب کی بہت کچھ الجھنیں تو اس بات کے سمجھ لینے ہی سے دور ہو جاتی ہیں کہ قرآن مجید بہت بڑی حد تک خطبائے عرب کے کلام سے مشابہت رکھتا ہے۔ جس طرح ایک خطیب محض اپنے رخ کی تبدیلی یا گردشِ چشم ابرو سے، بلکہ بسا اوقات لب و لہجہ کے تغیر اور معمولی التفات ہی سے اپنے مخاطب، اثنائے کلام کے اندر، بدلتا رہتا ہے۔ اُسی طرح قرآن مجید میں بھی خطاب کی تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں اور اگر قاری کلام کے پس منظر

پر نظر رکھتا ہو تو اس کو اس انتشارِ خطاب سے کوئی الجھن نہیں پیش آتی، بلکہ وہ کلام کی روانی کے ساتھ ساتھ بے تکلف مخاطب کو معین کرتا چلا جاتا ہے۔ لیکن اس کے بعض پہلو ایسے بھی ہیں جو ہر شخص کی گرفت میں آسانی کے ساتھ نہیں آتے اور جب تک ان کو گرفت میں لینے کی اچھی طرح مشق نہ بہم پہنچالی جائے وہ گرفت میں آ بھی نہیں سکتے۔

میں یہاں استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے مقدمہ تفسیر نظام القرآن سے تعیینِ خطاب والی فصل کا ضروری خلاصہ نقل کرتا ہوں، جس سے ایک بڑی حد تک اس مشکل کے حل کرنے میں مدد ملے گی۔ مولانا پندرھویں مقدمہ میں فرماتے ہیں:

'مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ پورا قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ یعنی اس کو اللہ تعالےٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ پورے قرآن میں تمام خطاب بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے؛ مثلاً 'اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ' (ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں) میں ظاہر ہے کہ خطاب بندہ کی طرف سے ہے۔ علماء اس مضمون کو یوں تعبیر کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سورہ بندوں کو تعلیم فرمائی ہے کہ یوں کہو، لیکن یہاں "کہو" کا لفظ موجود نہیں ہے تو اس مقدر کو کس طرح مانا جائے؟ اسی طرح کا سوال مخاطب کے بارہ میں پیدا ہوتا ہے، یعنی یہ خطاب کن سے ہے؟ ہر کتاب میں دو پہلو ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ خطاب کس کی طرف سے ہے؟ دوسرا یہ کہ خطاب کس سے ہے؟ اور ان دونوں کا حال یہ ہے کہ کبھی یہ عام ہوتے ہیں، لیکن مراد خاص ہوتی ہے اور کبھی خاص ہوتے ہیں اور مراد عام ہوتی ہے اور چونکہ اس تبدیلی اور اس کے عموم و خصوص کے سبب سے معانی میں بڑی اہم تبدیلیاں واقع ہو جاتی ہیں اس لیے ضروری ہے کہ ان کی تعیین کے لیے ایسے اصول دریافت کیے جائیں جو مشکلات میں رہنمائی کر سکیں'

'خطاب میں ایک مصدر ہوتا ہے اور ایک منتہیٰ۔ مصدر یا تو اللہ تعالیٰ ہوگا یا جبرئیلؑ یا رسولؐ یا لوگ۔ اسی طرح منتہیٰ یا اللہ تعالیٰ ہوگا یا رسولؐ یا لوگ۔ لوگوں

میں سے مسلمان ہوں گے یا منافقین یا اہل کتاب، یا ذرّیتِ اسماعیل، یا ان میں سے دو یا تین، یا سب۔ اہلِ کتاب میں سے یا تو یہود ہوں گے یا نصاریٰ، یا دونوں۔ یہ تو بالکل ظاہر پہلو ہوئے۔ اب ان کے التباس داختلاط کی صورتوں پر غور کیجیے۔ مصدرؔ میں التباس اللہ تعالیٰ، رسولؐ اور جبریل امینؑ کے مابین ہوتا ہے۔ اگر کوئی پورے تنبہ کے بغیر قرآن پڑھتا چلا جائے تو اس کو امتیاز کرنا مشکل ہوگا کہ کون قائل ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت جبریلؑ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ یہ کبھی مرسل کا قول نقل کرتے ہیں اور کبھی وہ بات خود ادا کردیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کی زبان پر جاری فرمائی ہے۔ پھر حضرت جبریلؑ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ یہ کبھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محض مبلّغِ کلامِ الٰہی کی حیثیت سے کلام کرتے ہیں اور کبھی آپ کے معلّم کی حیثیت سے۔

'قرآن مجید میں یہ تمام حیثیات ایک دوسرے کے ساتھ ملی جلی ہوئی بغیر کسی تنبیہ کے نمایاں ہوتی ہیں، اس وجہ سے ان کو معیّن کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے، اور سیاقِ کلام کے سوا کوئی دوسری چیز اس معاملہ میں رہنمائی کرنے والی نہیں ہوتی اور یہ چیز کچھ قرآن مجید ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ یہ چیز آسمانی کتابوں کی ایک مشترک خصوصیت معلوم ہوتی ہے۔

'قاعدہ کلیہ اس بارہ میں یہ ہے کہ جب کلام براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگا۔ تو اس میں جلال وہیبت اور قوت وسطوت کا اظہار ہوگا'۔ اس لیے اس طرح کا کلام صرف خاص خاص مواقع پر ظاہر ہوتا ہے۔ اس بات کو ایک مثال سے سمجھو۔ سورۃ علق شروع جبریلؑ کی زبان سے ہوتی ہے، لیکن جب کفّار پر غصّہ کے اظہار کا موقع آیا ہے تو کلام براہِ راست خدا کی طرف سے ہوگیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

'كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ (العلق ۹۶-۱۵)

(ہرگز نہیں، اگر یہ باز نہ آیا تو ہم اس کو گھسیٹیں گے، چوٹی پکڑ کر)۔

'منتہیٰ میں التباس نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کے درمیان ہوتا ہے۔ بعض ترجم

ظاہر یہ ہوتا ہے کہ خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، حالانکہ روئے سخن امت کی طرف ہوتا ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ امت کے وکیل ہونے کی حیثیت سے ان کی زبان اور ان کے کان ہونے کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لیے مخاطب آپ کو کیا جاتا ہے۔ تورات میں بھی اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ خطاب بظاہر صیغۂ واحد سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف ہے، لیکن مراد ان کی امت ہے۔ قرآن مجید میں اس طرح کے جو مواقع ہیں وہاں نظم اور سیاق و سباقِ کلام کی رہنمائی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ مخاطب کون ہے۔ سورۂ توبہ میں ایک آیت ہے: "اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ" (التوبۃ - ۹ : ۵۰) اگر تم کو کوئی کامیابی حاصل ہوتی ہے تو ان کو تکلیف پہنچتی ہے اور اگر تم کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں خوب ہوا، ہم نے اپنا بچاؤ پہلے ہی کر لیا) یہاں خطاب واحد کا ہے، لیکن مراد اس سے عام مومنین ہیں چنانچہ اس کے جواب سے اس کی وضاحت ہو گئی ہے۔ فرمایا: "قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ" (التوبۃ - ۹ : ۵۱) (کہہ دو نہیں پہنچے گی ہم کو کوئی مصیبت مگر جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دی ہے۔ وہ ہمارا مولا ہے اور چاہیے کہ اللہ ہی پر بھروسہ کریں اہل ایمان)۔ اسی طرح سورۂ بنی اسرائیل میں مخاطب بظاہر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا ہے، لیکن خطاب دراصل امت کی طرف ہے۔ فرمایا:

"اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا" —

(بنی اسرائیل - ۱۷ : ۲۳) (اگر وہ — یعنی ماں باپ — تیرے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں، ان میں سے ایک یا دونوں، تو نہ ان کو اف کہو اور نہ ان کو جھڑکو اور ان سے شریفانہ بات کہو)۔ اس طرح کی متعدد مثالیں

ہیں جو ہیں تو بظاہر خاص، لیکن مراد ان سے عام ہے؛

۳- تفسیر کا تیسرا قطعی اصول یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر قرآن سے کی جائے۔ قرآن مجید نے خود اپنی تعریف کتاباً متشابہاً کے الفاظ سے فرمائی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا ہر حصہ ایک دوسرے سے ملتا جلتا ہوا ہے۔ قرآن مجید میں ایک ہی بات کہیں اجمال کے ساتھ آتی ہے، کہیں تفصیل کے ساتھ؛ کہیں صرف دعویٰ کی شکل میں آتی ہے، کہیں دلیل کے ساتھ؛ کہیں کسی چیز کے ساتھ آتی ہے، کہیں کسی چیز کے ساتھ۔ ایک ہی بات کے اتنے گوناگوں پہلوؤں سے آنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ایک بات اگر ایک جگہ سمجھ میں نہ آئی تو دوسری یا تیسری جگہ سمجھ میں آجاتی ہے اور اگر ایک جگہ اس کا پہلو واضح ہونے سے رہ گیا تو دوسری جگہ کسی اور سیاق میں وہ ضرور واضح ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے قرآن کی تفسیر کا سب سے زیادہ معتبر ماخذ خود قرآنِ مجید ہے۔ اگر کوئی شخص قرآن کی مشکلات خود قرآن سے حل کرنے کی کوشش کرے تو ایک جگہ اگر کسی چیز کا نظم واضح نہیں ہوتا تو دوسری جگہ اس کا نظم واضح ہو جاتا ہے اور اگر ایک جگہ کسی چیز کی دلیل نہیں ملتی تو دوسری جگہ اس کی دلیل مل جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بسا اوقات اس کے اسالیب و محاورات تک کی مشکلات مختلف صورتوں میں بار بار نمایاں ہونے کی وجہ سے واضح ہو جاتی ہیں اور چونکہ قرآن مجید کا ہر حصہ یکساں طور پر قطعی ہے اس وجہ سے اس کے ایک حصہ کی تفسیر اس کے دوسرے حصہ کی مدد سے قطعی کی تفسیر قطعی کے ذریعے سے ہے، اس وجہ سے اس پر کسی بڑے سے بڑے منکر کو بھی حرف رکھنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔

۴- تفسیر کا چوتھا قطعی ماخذ سنّتِ متواترہ و مشہورہ ہے۔ جہاں تک قرآن مجید کی اصطلاحات کا تعلق ہے، مثلاً صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم، حج، قربانی، مسجدِ حرام، صفا، مروہ، سعی، طواف وغیرہ ان سب کی تفسیر سنّتِ متواترہ کی روشنی میں کرنی چاہیئے

اس لیے کہ قرآن مجید اور شریعت کی اصطلاحات کے معنی بیان کرنے کا حق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہے۔ اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ یہ بات قطعیت کے ساتھ معلوم ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اصطلاحات کا یہ مطلب بتایا ہے۔ سو اس چیز کی ضمانت یہ ہے کہ ان ساری اصطلاحات کا حقیقی مفہوم بالکل عملی شکل میں سنّتِ متواترہ کے اندر محفوظ کر دیا گیا ہے اور سنّتِ متواترہ بالکل انہی قطعی ذرائع سے ثابت ہے جن ذرائع سے خود قرآن مجید ثابت ہے۔ حق کہ جس تواتر نے قرآن مجید کو ہم تک منتقل کیا ہے اسی تواتر نے دین کی تمام اصطلاحات کا عملی مفہوم بھی ہم تک منتقل کیا ہے، اس لیے اگر قرآن مجید کا ماننا ہم پر واجب ہے تو ان ساری اصطلاحات کی اس شکل کو ماننا بھی واجب ہے جو سلف سے خلف تک منتقل ہوئی ہے۔ ان کی صورت میں اگر کوئی اختلاف ہے تو یہ چیز کوئی اہمیت ہمارے دین میں نہیں رکھتی۔ پانچ وقت کی نماز سب جانتے اور مانتے ہیں اور اسی قطعیت کے ساتھ جانتے اور مانتے ہیں جس قطعیت کے ساتھ خود قرآن مجید کو جانتے اور مانتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ اس میں آمین بالجہر ہے یا آمین بالسّر تو یہ بات اختلافی ہو سکتی ہے اور اس طرح کے اختلافاتِ جزئیہ کی ہمارے دین میں کوئی اہمیت نہیں ہے جو اخبارِ آحاد سے نکلتی ہیں۔ ان میں جس شخص کا دل جس شخص پر مطمئن ہو اس کو اختیار کرے اور ایک دوسرے کی تردید و مخالفت کے درپے نہ ہو، لیکن جو باتیں سنّت متواترہ سے ثابت و معلوم ہیں ان کی مخالفت کرنا خود قرآن مجید کی مخالفت کرنا ہے اور قرآن کی مخالفت کرنے والے کے لیے ہمارے دین میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

منکرینِ حدیث کی یہ جسارت کہ وہ صوم و صلوٰۃ، حج و زکوٰۃ اور عمرہ و قربانی کا مفہوم بھی خود اپنے گھر سے بیان کرتے ہیں اور امت کے تواتر نے ان چیزوں کی جو شکل محفوظ رکھی ہے اس میں اپنی ہوائے نفس کے مطابق ترمیم و تغیر پیدا کرنے

کے درپے ہیں، صریحاً خود قرآن کے انکار کے ہم معنی ہے، اس لیے کہ جس تواتر نے
ہم تک قرآن کو منتقل کیا ہے اسی تواتر نے ان اصطلاحات کی عملی صورتوں کو بھی
ہم تک منتقل کیا ہے، اس لیے اگر وہ ان کو نہیں مانتے تو پھر خود قرآن کے ماننے
کے لیے بھی کوئی وجہ باقی نہیں رہ جاتی۔ اس گروہ کے جہلاء نے قرآنی اصطلاحات
کے قطعی اور مسلّم مفاہیم کے بدلنے کے سلسلہ میں جو جسارتیں کی ہیں ان کا اندازہ آپ
کو ایک حد تک ان بحثوں سے ہوا ہوگا جو گاہ گاہ قربانی سے متعلق ایک گروہ کی
طرف سے اخبارات میں اٹھتی رہتی ہیں۔ اور اب تو ان لوگوں نے دنیا اور آخرت
جیسی مشہور اصطلاحات کا مفہوم بھی اپنے اغراض و اہوائے کے مطابق گھڑ لیا ہے۔ دنیا
کے معنی ہیں حاضر اور آخرت کے معنی ہیں مستقبل، اور قرآن میں یہ جو حکم ہے کہ اپنی آخرت
کی فلاح کے لیے خرچ کرتے رہو تو اس کا مطلب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ سب
اپنی موجودہ ضروریات ہی پر نہ صرف کر ڈالو بلکہ مستقبل کی ضروریات کے لیے
کچھ بنک میں بھی محفوظ کرو۔

اس سلسلہ میں مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مقدمۂ تفسیر نظام القرآن
میں فرماتے ہیں:

> اسی طرح تمام اصطلاحاتِ شرعیہ، مثلاً نماز، زکوٰۃ، جہاد، روزہ،
> حج، مسجدِ حرام، صفا، مروہ اور مناسکِ حج وغیرہ اور ان کے ساتھ جو اعمال
> متعلق ہیں تواتر و توارث کے ساتھ سلف سے لے کر خلف تک سب محفوظ
> رہے اس میں جو معمولی جزوی اختلافات ہیں وہ بالکل ناقابلِ لحاظ ہیں۔ شیر کے
> معنی سب کو معلوم ہیں اگرچہ مختلف ممالک کے شیروں کی شکلوں اور صورتوں میں
> کچھ نہ کچھ اختلافات ہیں۔ اسی طرح جو نماز مطلوب ہے وہ وہی نماز ہے جو
> مسلمان پڑھتے ہیں، ہرچند کہ اس کی ہیئت میں بعض جزوی اختلافات ہیں۔

جو لوگ اس طرح کی چیزوں میں زیادہ کھوج کرید سے کام لیتے ہیں وہ اس

دینِ قیمّ کے مزاج سے بالکل ناواقف ہیں، جس کی تعلیم قرآن پاک نے دی ہے۔

پس جب ایسے اصطلاحی الفاظ کا معاملہ پیش آئے جن کی پوری حد اور تصویر قرآن میں نہ بیان ہوئی ہو تو صحیح راہِ عمل یہ ہے کہ جتنے حصہ پر تمام امت متفق ہے اتنے پر قناعت کرو اور اخبارِ آحاد پر نہ جم جاؤ ورنہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خود شک میں پڑو گے اور دوسروں کے اعمال کو غلط ٹھہراؤ گے اور تمہارے درمیان کوئی ایسی چیز نہ ہوگی جو اس جھگڑے کا فیصلہ کر سکے[1]۔

تفسیر کے ظنّی ماخذ:

اب میں چند حرف آپ کے سامنے تفسیر کے ظنّی ماخذوں کی بابت عرض کروں گا۔ ظنّی سے میری مراد یہ ہے کہ ان کے اوپر ہر حال میں پورا پورا اطمینان نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان کے اندر چونکہ ظن اور شبہ کو دخل ہے اس لیے ان کو قرآن کی تفسیر میں وہیں تک دخیل بنایا جا سکتا ہے جہاں تک وہ قرآن سے موافقت کریں۔ اگر کوئی بات ان کی قرآن مجید کے خلاف پڑے تو ایسی صورت میں فیصلہ کن بات قرآن کی ہوگی۔ ان کو نظر انداز کر دیا جائے گا۔

۱۔ تفسیر کے ظنّی ماخذوں میں سب سے اشرف اور سب سے زیادہ پاکیزہ چیز احادیث و آثارِ صحابہ ہیں۔ اگر ان کی صحت کی طرف سے پورا پورا اطمینان ہوتا تو تفسیر میں ان کو وہی اہمیت حاصل ہو جاتی جو اہمیت سنّتِ متواترہ کی بیان ہوئی ہے لیکن چونکہ ان کی صحت پر پورا پورا اطمینان نہیں کیا جا سکتا اس لیے ان سے تفسیر میں اسی حد تک فائدہ اٹھایا جائے گا جہاں تک یہ ان قطعی اصولوں کی موافقت کریں جو اوپر بیان ہوئے ہیں۔ جو لوگ احادیث و آثار کو اس قدر اہمیت دے دیتے ہیں کہ اُن کو خود قرآن پر حاکم بنا دیتے ہیں وہ درحقیقت قرآن کو بھی نقصان پہنچاتے

ہیں اور احادیث کی بھی وہ کوئی شان نہیں بڑھاتے۔ اس کے برعکس جو لوگ احادیث کا سرے سے انکار کر دیتے ہیں وہ اس روشنی ہی سے محروم ہو جاتے ہیں جو قرآن مجید کے بہت سے اجمالات کے کھولنے میں سب سے زیادہ مددگار ہو سکتی ہے۔ اعتدال کی راہ اس معاملہ میں یہ ہے کہ قرآن مجید کے اجمالات جس حد تک صحیح احادیث کی روشنی میں کھلتے ہوں اُس حد تک ان صحیح احادیث کی رہنمائی سے پورا فائدہ اٹھایا جائے اور ان کے بالمقابل ہرگز کسی دوسری چیز کو ترجیح نہ دی جائے؛ اور اگر حدیث صریحاً قرآن مجید کے الفاظ اور اس کے سیاق و نظم کے خلاف پڑ رہی ہو تو ایسے مقامات پر توقّف کرنا چاہیے اور ایسی صورت میں حدیث کو چھوڑنا چاہیے، جب یا تو کسی طرح الفاظِ قرآن سے اس کی موافقت ہو ہی نہ سکتی ہو یا حدیث کے ماننے کے سبب سے دین کی کسی ایسی اصل پر زد پڑ رہی ہو جس کا ماننا ضروری ہو۔ جہاں تک صحیح احادیث کا تعلق ہے بہت کم ہی ایسی نوبت آئی ہے کہ قرآن کے ساتھ ان کی موافقت ہو ہی نہ سکے۔ ایسے مواقع پر بہرحال مقدّم قرآن ہے اور کسی طرح بھی اس کے تقدّم کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ایسے مواقع بہت زیادہ نہیں ہیں۔

شانِ نزول سے متعلق جو روایات ہیں اُن کی سند کی جانچ پرکھ کے ساتھ ساتھ ان کے بارہ میں یہ اصولی حقیقت بھی ملحوظ رکھنی چاہیے کہ ہمارے سلف کسی آیت کی شانِ نزول سے متعلق جو متعیّن واقعات نقل کرتے ہیں تو اس سے اُن کی مراد یہ نہیں ہوتی کہ بعینہٖ یہی واقعات اس آیت کے نزول کا سبب ہیں بلکہ اس سے مراد بالعموم یہ ہوتی ہے کہ یہ آیت اس طرح کے حالات و واقعات کے لیے اپنے اندر احکام رکھتی ہے۔ اس بات کی تصریح ہمارے بڑے بڑے علمائے تفسیر نے کی ہے اور اس سے شانِ نزول کے سلسلہ کی اکثر مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔

شانِ نزول کا زیادہ اہتمام صرف ان مقامات میں کرنا چاہیے جہاں قرآن نے کسی متعین واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہو۔ مثلاً سورۂ تحریم یا سورۂ احزاب میں قرآن نے بعض واقعات کی طرف اجمالی طور پر اشارہ کیا ہے۔ اس طرح کے واقعات کی وہ تفصیلات احادیث سے لینی چاہئیں جو قرآن کے موافق پڑتی ہوں اور ان باتوں کو نظر انداز کر دینا چاہیے جن کے تسلیم کرنے سے قرآن مجید اباء کرتا ہو یا ان کے ماننے سے ان لوگوں کی زندگیوں پر حرف آتا ہو جن کی زندگیوں کے بالکل پاکیزہ اور معصوم ہونے کی خود قرآن نے گواہی دی ہو۔

۲۔ اسی طرح قوموں کی ثابت شدہ تاریخ سے بھی ہمیں تفسیرِ قرآن میں مدد لینی چاہیے۔ قرآن مجید نے متعدد پہلوؤں سے قوموں کی تاریخ کی طرف اشارے کیے ہیں۔ کہیں عرب کی پچھلی قوموں، مثلاً عاد، ثمود، مدین اور قومِ لوط وغیرہ کی تباہی کا ذکر کیا ہے؛ کہیں اہلِ عرب کو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے مکہ میں آنے، بسنے اور خانۂ کعبہ کی تعمیر کے واقعات کی طرف توجہ دلائی ہے؛ کہیں یہود و نصاریٰ کی تاریخ کے اہم واقعات کی طرف اشارے کیے ہیں؛ کہیں کہیں زمانۂ نزول کی بعض معاصر قوموں اور ان کے بعض اہم حالات کی طرف اشارے کر دیے ہیں، اس طرح سے بے شمار تاریخی چیزیں ہیں جو کسی نہ کسی نوعیت سے قرآن میں زیرِ بحث آ گئی ہیں۔ ان سارے اشارات کو وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لیے ان قوموں کی تاریخ اور ان کے حالات سے فی الجملہ واقف ہونا ضروری ہے ورنہ وہ مقاصد اچھی طرح دل نشیں نہیں ہو سکتے جن کے لیے قرآن مجید نے یہ واقعات بیان

ان تمام تاریخی معلومات کے لیے اس پہلو سے تو ہم ضرورت مند ہیں کہ ان سے قرآن مجید کے بعض اجمالات کی شرح ہوتی ہے، لیکن چونکہ ان کا ثابت حصہ

بہت کم ہے اس لیے ان کے لیے بھی کسوٹی کا کام ہم قرآن مجید ہی سے لیں گے۔ یعنی ان کی جو باتیں قرآن کے موافق ہوں گی ان کو ہم لے لیں گے اور جو باتیں قرآن کے خلاف پڑیں گی ان کو چھوڑ دیں گے۔

اس پہلو سے غور کیجیے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ قرآن مجید نے انسانیت پر جو عظیم احسانات کیے ہیں وہ تو الگ رہے، اس نے علم پر اور تاریخ پر جو احسانات کیے ہیں دنیا اگر انہی کا شکریہ ادا کرنا چاہے تو اس کا صحیح حق ادا نہیں کر سکتی۔ ہمارا فنِ تاریخ ایک بالکل بے جان سی چیز تھا جس سے انسان کو اگر کوئی چیز حاصل ہوتی تھی تو صرف یہ کہ تاریخ کے کچھ واقعات افسانہ کے طور پر دہرا دیے جائیں اور ان سے وقتی طور پر فخرِ آباء کے جذبہ کو کچھ تسکین بہم پہنچا دی جائے۔ قرآن نے تاریخ ایک بالکل نئے نقطۂ نظر سے پیش کی۔ اس نے اس کو قوموں کے عروج و زوال کی ایک عبرت انگیز سرگزشت کی حیثیت سے پیش کیا اور ناقابلِ تردید دلائل سے ثابت کر دیا کہ قوموں کے عروج و زوال میں اصلی عامل انفرادی و اجتماعی اخلاق ہی ہے۔ تاریخ کو یہ نیا جلوہ دے کر قرآن مجید نے ہر قوم کی تاریخ کو، جس کو قصّوں اور افسانوں سے زیادہ کوئی اہمیت حاصل نہ تھی، دنیا کی رہنمائی اور ہدایت کے لیے سب سے زیادہ قیمتی چیز بنا دیا۔ خصوصیت کے ساتھ بنی اسمٰعیل اور بنی اسرائیل کی تاریخ پر قرآن نے جو احسانات کیے ہیں ان کے لیے تو تمام دنیا کو قرآن کا ممنون ہونا چاہیے اس لیے کہ ان قوموں کی تاریخ صرف قوموں ہی کی تاریخ نہ تھی، بلکہ درحقیقت یہ دنیا کے جلیل القدر انبیاء کے کارناموں کی تاریخ تھی اور اس تاریخ کا مسخ ہو جانا ——— جیسا کہ وہ عربوں اور یہودیوں کے ہاتھوں ہو گئی تھی ——— دنیا کا ایک بہت بڑا حادثہ تھا۔ اس سے ہدایت کے وہ تمام نشانِ راہ ناپید ہو گئے تھے جو خدا کے صالح بندوں نے انسانیت کی رہنمائی کے لیے نصب کیے تھے۔ یہ قرآن مجید کا کارنامہ ہے کہ اس نے اس تاریخ کے

وہ مٹائے ہوئے نشانات اجاگر کیے اور اس کو ازسرِنو اس طرح پیش کیا کہ اب قیامت تک کے لیے اس کا ہر نقش بالکل غیر فانی بن گیا۔

۳۔ تفسیر کے ظنّی ماخذوں میں تیسری چیز قدیم آسمانی صحیفے ہیں۔ اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء کے پاک گروہ کے ایک فرد اور قرآن مجید آسمانی صحیفوں کے زمرہ کی ایک کتاب ہے، اس لیے قرآن مجید کی تفسیر و توضیح میں دوسری آسمانی کتابوں سے نہایت قیمتی مدد مل سکتی ہے۔ جہاں تک حصولِ ہدایت کا تعلق ہے اب قدیم آسمانی صحیفوں کی رہنمائی کے ہم محتاج نہیں رہے۔ ہدایت و رہنمائی کے لیے خدا کی آخری کتاب، جو ہر نقص سے پاک ہے، ہمارے لیے کافی ہے جس طرح سورج کے طلوع ہو جانے کے بعد ستاروں کی رہنمائی کی احتیاج باقی نہیں رہتی اسی طرح قرآن کے نزول کے بعد کسی اور کتاب کی احتیاج باقی نہیں رہی۔ لیکن مختلف پہلو ہیں جو تقاضا کرتے ہیں کہ ہم قدیم آسمانی صحیفوں سے براہِ راست واقفیت حاصل کریں۔

اوّل یہ کہ قرآن مجید کے بہت سے اشارات کی وضاحت کے لیے ہمارے علماء کو اہلِ کتاب سے روایات لینی پڑی ہیں اور وہ روایات چونکہ تمام تر سنی سنائی باتوں پر مبنی ہیں اس لیے ان کی کوئی علمی قدر و قیمت نہیں ہے نہ وہ اہلِ کتاب پر حجت ہو سکتی ہیں اور نہ ہم ان پر اپنے کسی دعویٰ یا دلیل کی بنیاد رکھ سکتے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ ہم براہِ راست قدیم صحیفوں کا علم حاصل کریں تاکہ ان چیزوں کے بارہ میں ہم جو کچھ کہیں وہ علیٰ وجہ البصیرت کہیں۔

دوم یہ کہ قرآن مجید پچھلے صحیفوں کی تعلیمات کو مکمل کرتا ہے اور ان میں جو خرابیاں پیدا کر دی گئی ہیں ان کی اصلاح کرتا ہے، اس لیے جب آدمی قرآن مجید کے ساتھ قدیم صحیفوں کو پڑھتا ہے تو اس پر قرآن مجید کی عظمت و برتری واضح ہوتی ہے اور اس

امت پر اللہ تعالیٰ نے جو فضلِ عظیم اس کتاب کے ذریعہ سے فرمایا ہے اس کے گوناگوں پہلو بے نقاب ہوتے ہیں۔

سوم یہ کہ قرآن مجید نے بیانِ احکام کے سلسلہ میں بھی اور تاریخی واقعات کے ذکر کے ذیل میں بھی جگہ جگہ ایسی تلمیحات رکھ دی ہیں جو اس وقت تک پوری طرح واضح نہیں ہوسکتی ہیں جب تک آدمی قدیم صحیفوں سے واقف نہ ہو۔ ہمارے مفسرین میں سے بیشتر حضرات چونکہ تورات وانجیل سے براہِ راست واقف نہ تھے اس وجہ سے اس طرح کی تلمیحات کو وہ اچھی طرح کھول نہ سکے۔

چہارم یہ کہ قرآن مجید نے یہود و نصاریٰ کو اس بات کا مجرم گردانا ہے کہ انہوں نے خدا کی کتاب میں تحریفیں کی ہیں۔ ان کے اندر بہت سی ایسی چیزیں شامل کر دی ہیں جو ان میں نہیں تھیں اور کتنی چیزیں نکال دی ہیں جو ان میں نہایت تصریح کے ساتھ بیان ہوئی تھیں۔ نیز انہوں نے بے شمار معاملات میں اپنی روش صریحاً اللہ اور اس کے نبیوں کے بتائے ہوئے طریقے کے خلاف بنالی ہے۔ کتنے حرام حلال ٹھہرا لیے ہیں اور کتنے حلال حرام کر دیے ہیں۔ اس طرح کی ساری باتوں کو مدلل کرنے کے لیے ضرورت ہے کہ آدمی کی نظر تورات وانجیل پر ہو ورنہ اہلِ کتاب پر کما حقہ، حجت پوری نہیں ہوسکتی۔

پنجم یہ کہ ان تمام خرابیوں کے باوجود جو قدیم صحیفوں میں واقع ہوگئی ہیں ان کے اندر اللہ تعالیٰ اور اس کے نبیوں کے کلام کا ایک حصہ موجود ہے جس کو وہ شخص آسانی کے ساتھ پہچان لے سکتا ہے جو قرآن مجید سے واقف ہو۔ اللہ اور اس کے نبیوں کے کلام کا یہ حصہ درحقیقت مومن کا ایک گم شدہ خزانہ ہے اور مومن اس بات کا حق دار ہے کہ وہ جہاں بھی اس خزانہ کو پائے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرے

فہرست کتب

تالیفاتِ امام حمید الدین فراہیؒ

۱۔ مجموعہ تفاسیرِ فراہی
۲۔ اقسام القرآن
۳۔ ذبیح کون ہے

تالیفاتِ مولانا امین احسن اصلاحی

۱۔ تدبرِ قرآن (۹ جلد)
۲۔ مبادیٔ تدبرِ قرآن
۳۔ مبادیٔ تدبرِ حدیث
۴۔ حقیقتِ شرک و توحید
۵۔ حقیقتِ نماز
۶۔ حقیقتِ تقویٰ
۷۔ تزکیۂ نفس (۲ جلد)
۸۔ دعوتِ دین اور اس کا طریقِ کار
۹۔ اسلامی قانون کی تدوین
۱۰۔ اسلامی ریاست
۱۱۔ اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل
۱۲۔ اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام
۱۳۔ قرآن میں پردے کے احکام
۱۴۔ فلسفے کے بنیادی مسائل قرآن حکیم کی روشنی میں
۱۵۔ مقالاتِ اصلاحی - جلد اوّل
۱۶۔ تفہیمِ دین